دینی تعلیم کا رسالہ
ادارہ فیضانِ حضرت گنگوہی رح
مصنف
حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ
سابق ناظم، جمعیۃ علماء ہند
منظور کردہ
مرکزی دینی تعلیمی بورڈ، جمعیۃ علماء ہند
۱۲

بعون الله
علی الجماعۃ

(۱)

ہفت مجالس

استاد اور شاگردوں کی

سات مجلسیں

انسان کی حقیقت۔ کائنات عالم میں انسان کی حیثیت
انسان کی خصوصیتیں۔ انسانیت کے تقاضے
فرائض اور کمالات

ناشر

عزیزان گرامی

ہونہار ذہین اور شوقین بچّے خود مطالعہ کریں، سمجھیں اور سمجھائیں۔ ہفتہ واری جلسوں میں یہ مضامین بیان کریں یا تقریر کے طور پر پڑھ کر سنائیں۔

یہ مضامین بچوں کی طرح بڑوں کے لئے بھی مفید ہوں گے (انشاء اللہ)

الجمعیۃ آفسٹ پریس دہلی
لیتھو

تیسرا باب: اسلامی اخلاق

انسانی شرافت و عظمت اور اس کے تقاضے

ہفت مجالس

(سات مجلسیں)

انسان کی حقیقت اور کائنات عالم میں انسان کی حیثیت

پہلی مجلس

کچھ شوقین اور محنتی بچے صبح کی نماز سے بہت پہلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جماعت کے وقت تک اپنی تمام ضرورتوں سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور پھر مدرسہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدرسہ کے وقت سے بہت پہلے مدرسہ میں پہنچ کر کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی آپس میں آموختہ دہراتے ہیں اور کبھی کوئی علمی بات چھڑ جاتی ہے تو بڑی سنجیدگی سے بحث میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کی بات چیت شریف بچوں کی طرح آہستہ آہستہ نرمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کا ادب کرتے ہیں۔ ہر ایک کی عزت کا خیال رکھتے ہیں۔ اونچی آواز سے بات چیت نہیں کرتے جس سے خواہ مخواہ

شور ہو۔ ایک دوسرے کی بات بھی نہیں کاٹتے۔ بلکہ جب ایک بچہ اپنی بات پوری کر لیتا ہے، تب دوسرا بچہ بات شروع کرتا ہے۔ کچھ شریر بچے شرارت کرنے لگتے ہیں تو یہ ان کو بھی بڑی نرمی سے سمجھا کر کام پر لگا دیتے ہیں۔

انھیں بچوں میں سے ایک نے جس کا نام "رشید" ہے اپنے ساتھی "مسعود" سے آج ایک عجیب سوال کیا۔ اس نے پوچھا۔ بتاؤ۔ ہم کیا ہیں ؟ اور ہماری حیثیت کیا ہے ؟

مسعود: یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم آدمی ہیں اور ہماری حیثیت وہی ہے جو آدمیوں کی ہوتی ہے

رشید: بے شک ہمیں آدمی بھی کہا جاتا ہے مگر اس سے نہ ہماری حقیقت معلوم ہوتی ہے نہ حیثیت۔ کیونکہ " آدمی " میں یا ر نسبت کی ہے۔ آدمی کا مطلب ہوا۔ آدم والا یعنی آدم کی اولاد۔ پس آدمی سے صرف یہ معلوم ہوا کہ ہم حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔ جیسے ہاشمی اس کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا " ہاشم " کی اولاد میں ہو۔ " علوی " وہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہو۔ مگر اس سے ہاشم یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔

ہمایوں: ایک لڑکے کا نام " ہمایوں " تھا۔ یہ بنگال کا رہنے والا پتلا دبلا سیاہ فام تھا۔ مگر بڑا ذہین اور محنتی تھا۔ اس نے مسعود سے مخاطب ہو کر کہا:

یہ مت کہو " ہم آدمی ہیں " یہ کہو " ہم انسان ہیں "

رشید نے جیسے ہی " ہمایوں " کا جواب سنا، فوراً بولا بے شک ہم " انسان "

ہیں۔ مگر سوال تو یہی ہے کہ "انسان" کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔

مسعود: میاں رشید صاحب، حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقت کسی چیز کی بھی معلوم نہیں۔ تمام دنیا کے فلاسفہ اور ماہرین سائنس اعتراف کرتے ہیں کہ اصل حقیقت کسی چیز کی بھی اب تک پوری طرح معلوم نہیں ہو سکی۔ کچھ باتیں جو علامت یا خصوصیت کے طور پر سامنے آتی ہیں ان کو حقیقت کہہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان ایک جاندار ہے جس کا قد لانبا ہوتا ہے۔ چہرہ کھلا ہوا، کھڑا ہو کر چلتا ہے۔ آپس میں ہنسی مذاق اور بول بات کرتا ہے۔ وغیرہ

مجیب: یہ لڑکا ذہین مانا جاتا ہے۔ اس نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ علماء فلسفہ تو کہتے ہیں کہ انسان "حیوان ناطق" ہے۔ حیوان کے معنی جاندار جو اپنے ارادہ سے چل پھر سکے اور ناطق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر قوتِ ادراک رکھتا ہے یعنی اس کو حق تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ جو باتیں اس کو معلوم ہیں ان میں غور و فکر کر کے نامعلوم باتوں کو دریافت کر لیتا ہے۔ ریسرچ اور تحقیقات کی صلاحیت اور کسی جاندار میں نہیں ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔ اُسی کو منطقی "نطق" کہتے ہیں اور اسی بنا پر انسان کو "حیوان ناطق" کہتے ہیں۔

مجیب کے برادر حقیقی منیب صاحب ہیں۔ یہ بھی اسی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ مجیب صاحب کی تقریر سنی تو میاں منیب پیشانی پر بل ڈال کر بولے۔ آپ تو منطقی باتوں میں پڑ گئے۔ منطقی تو خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔ اگر بات یہی ہے کہ انسان حیوان ہے تو اس کے لئے شریعت کیوں نازل کی گئی۔ کسی اور حیوان کے لئے دین کیوں نازل نہیں ہوا اور اگر یہ کہتے ہیں کہ دین اور شریعت کا مدار عقل یعنی

غور و فکر کی قوّت پر ہے تو پھر عقل ہی دین و شریعت کی موجد ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے نازل ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک لڑکا بہت ہنس مکھ اور ظریف ہے۔ اتفاق سے اس کا نام بھی ظریف ہی ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھئی ہم تو سمجھتے ہیں انسان "قدرت کا لاڈلا ہے"۔ قدرت نے انسان کو پیدا کیا۔ خشکی۔ تری، فضار آسمانی اور تحت الثریٰ کے تمام خزانے اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو اپنے کام میں لاتا ہے۔

متین: لاڈلا ہی نہیں، بلکہ یہ بھی کہو کہ انسان "دستِ قدرت کا شاہ کار" اور ایسا عجیب و غریب نمونہ ہے کہ پوری کائنات میں نہ اس کی کوئی مثال ہے نہ نظیر۔

ایک اور طالب علم جو کسی قدر صوفی مزاج ہے۔ اس کا نام "ابوالہول" ہے وہ اپنے محلہ والوں سے پریشان رہتا ہے۔ وہ جھنجھلا کر بولا۔ میاں سچ بات تو یہ ہے کہ انسان ایک ایسا حیوان ہے جو بہت بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ یہ اس کا ظلم ہی ہے کہ جس پر اس کا قابو چلتا ہے اس کے ساتھ من مانی کرتا ہے۔ بیل، گھوڑے، گدھے، یہاں تک کہ اونٹ اور ہاتھی جیسے ڈیل ڈول کے جانوروں کو قابو میں کر لیتا ہے۔ شیر جیسے خونخوار درندے کو پنجرے میں بند کر لیتا ہے۔ پھر جس کو چاہتا ہے زندہ رکھ کر اس سے اپنا کام لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذبح کر کے اس کا گوشت کھا جاتا ہے۔ جانوروں سے گزر کر زمین، پہاڑ، سمندر، ہوا اور فضار آسمانی کی دوسری چیزوں پر بھی اسی طرح تصرف کرتا ہے۔ پہاڑوں کے پتھر

توڑ توڑ کر سڑکیں بناتا ہے۔ درخت کاٹ کر اعلیٰ سے اعلیٰ فرنیچر تیار کرتا ہے۔ فالتو لکڑی ایندھن کے کام میں لاتا ہے۔ سمندر کی تہہ میں غوطے لگا کر قیمتی موتی برآمد کرتا ہے۔ زمین کی رگوں سے تیل اور پٹرول کے چشمے بہاتا ہے۔ فضائے آسمانی میں ہوائی جہاز اڑاتا ہے۔ ایٹمی بموں کی زہریلی گیس سے ساری فضا کو زہر آلود کر دیتا ہے یہ تصرف بے جا اور یہ چیرہ دستی اور دست درازی ظلم نہیں ہے تو کیا ہے؟

پھر جہالت دیکھو جن سے وہ اپنے تمام کام نکالتا ہے ان کا احسان نہیں مانتا اور احسان ماننا تو درکنار خود ان کے وجود سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ بھلا اس میں بھی کوئی شک ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی ذات ہے جس نے خود اس کو اور ان تمام چیزوں کو پیدا کیا جن سے یہ اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ مگر تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جو لوگ دنیا میں بڑے عقلمند، فاضل اور دانشمند مشہور رہیں۔ جو سیاست میں اتنا اونچا مقام رکھتے ہیں کہ وزیر اعظم یا صدر مملکت ہیں، اُن کی عقل ہر جگہ چلتی ہے۔ مگر جب یہ معاملہ سامنے آتا ہے کہ اس مخلوق کا کوئی خالق بھی ہے تو ان کی عقلوں پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ یہ جہل اور سراسر جہل نہیں ہے تو کیا ہے؟

اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو خبر نہیں ہے کہ کل کیا ہوگا اور گھمنڈ یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے واقف ہے اور جو چیز ان کی سمجھ میں نہ آئے تو اُس کے وجود ہی سے انکار ہے۔

یہ درست ہے کہ انسان نے بے شمار ایجادیں ایسی کیں کہ کچھ دنوں پہلے، خود انسان کے وہم و گمان میں بھی یہ ایجادیں نہیں تھیں۔ یہ اس کے علم اور

ذہانت کی دلیلیں ہیں مگر اس کے ساتھ ظلم اور جہل بھی ملاحظہ ہو کہ زیادہ تر ایجادیں وہ ہیں جو خود اس کے لئے تباہ کن ہیں اور وہ جانور جن کو وحشی اور درندے کہا جاتا ہے وہ بے شک جانوروں کو پھاڑتے ہیں مگر اپنے ہم جنسوں کو نہیں پھاڑتے۔ مگر حضرت انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ذہانت اور عقل اس میں صرف ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کو جن سے اختلاف ہو کس طرح تباہ اور برباد کر سکتے ہیں۔ اُن کو فخر اُن آلات پر ہوتا ہے جن سے وہ اپنے ہم جنسوں کو زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ برباد کر سکیں اور ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ یہ ظلم و جہل نہیں ہے تو کیا ہے۔؟

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مدرسہ کا وقت ہو گیا۔ گھنٹی بجنی شروع ہوئی سب بچے اپنے اپنے درجوں میں قاعدے سے بیٹھ گئے اور جب استاد صاحب درجہ میں داخل ہوئے تو سب نے کھڑے ہو کر ادب سے سلام کیا۔

پہلا گھنٹہ دینیات کا تھا۔ دینیات کے استاد سلجھی ہوئی طبیعت کے بہت اچھے "عالم" تھے۔ یہ بچے جو بحث کر رہے تھے انھوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ اُستاد صاحب کے سامنے یہ مسئلہ رکھیں۔ چنانچہ "متین" جو اس درجہ میں پیش پیش رہا کرتے تھے کھڑے ہو کر اور حضرت استاد صاحب سے پوری بات بیان کی کہ ہم ایک سوال میں اُلجھے ہوئے تھے کہ انسان کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے اس کا جواب دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے جواب آپ کو سنائیں اور جناب والا ہماری اصلاح فرمائیں۔

استاد صاحب نے جیسے ہی سوال سنا فرمایا "ماشاءاللہ" سوال بہت اچھا

ہے اور واقعہ یہ ہے کہ سوال ایسا ہے کہ ہر متنفس کو ہوش سنبھالتے ہی سب سے پہلے اس سوال کا جواب طے کرلینا چاہیئے تاکہ اس کے بموجب وہ اپنی زندگی کا پروگرام بنائے اور اس پر عمل کرکے دین اور دنیا کی کامیابی حاصل کرے۔ مگر عزیزو! یہ وقت سبق کا ہے۔ مذاکرہ کا وقت نہیں ہے۔ جو وقت جس کام کا ہو اس کو اسی میں صرف کرنا چاہیئے۔ جو کام بے وقت ہو وہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو مگر بے موسم ہوتا ہے۔ اس سے وقت کا کام پچھڑ جاتا ہے۔ اس کا اثر پورے پروگرام پر پڑتا ہے اور یہ ایک طرح کی خیانت بھی ہے کہ مدرسہ کی طرف سے جو وقت جس کام کے لئے مقرر ہے اس وقت میں وہ کام نہ کیا جائے۔

حضرت استاد نے فرمایا۔ مذاکرہ کے لئے جمعرات کا دن مقرر ہے آپ جمعرات کے روز اسی گھنٹہ میں یہ سوال پیش کریں انشاء اللہ تفصیل سے جواب دیا جائے گا۔

دوسری مجلس

انسان کی خصوصیتیں اور علامتیں

بچے بڑی بے چینی سے جمعرات کے دن کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے آج یہ دن آیا۔ بچوں کو سبق پڑھنے سے زیادہ اس بحث میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ سب لڑکے بڑے شوق سے وقت سے پہلے ہی مدرسے پہنچ گئے اور استاد صاحب کے تشریف لانے کا انتظار کرنے لگے۔

گھنٹی بجی، مدرسہ کا کام شروع ہوا۔ استاد صاحب ٹھیک وقت پر درجہ میں داخل ہوئے۔ بچوں نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ جیسے ہی استاد صاحب بیٹھے۔ بچوں نے یاد دلایا کہ آج مذاکرہ کا دن ہے اور جناب نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہمارے سوال کا جواب آج دیں گے۔

حضرت استاد۔ بالکل ٹھیک۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ خود تم نے کیا سوچا ہے۔ اب ہر ایک بچہ کھڑا ہوا اور جس نے جو جواب اُس روز دیا تھا اسی کو دُہرایا۔ استاد صاحب نے سب کے جواب سُنے۔ پھر فرمایا۔

یہ ٹھیک ہے۔ آدمی حقیقت نہیں بلکہ نسبت ہے۔ یعنی یہ کہ ہم اولادِ آدم ہیں (علیہ السلام)

بیشک ہمیں انسان بھی کہا جاتا ہے مگر اس سے بھی ایک خصوصیت ہی معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ "انسان" اُنس سے ماخوذ ہے۔

چونکہ میل ملاپ، ساتھ رہنا اور آپس میں محبّت کرنا انسان کی فطرت ہے۔

اس لئے اس کو انسان کہتے ہیں۔ میاں مسعود نے انسان کی کچھ خصوصیتیں بیان کی ہیں کہ اس کا قد سیدھا ہوتا ہے۔ خاص قسم کا چہرہ ہوتا ہے۔ وہ آپس میں بات چیت کر سکتا ہے۔ لکھ پڑھ سکتا ہے۔ تو جس طرح یہ باتیں انسان کی خصوصیتیں ہیں۔ ایسے ہی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کا پریم و محبّت اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے۔ گائے اپنے بچّے سے اس وقت تک محبت کرتی ہے جب تک وہ دودھ پیتا ہے۔ مرغی یا کبوتر اپنے بچوں کو اس وقت تک پالتے ہیں جب تک وہ خود دانا نہیں چُگ سکتے اور جب وہ بڑے ہوجاتے ہیں تو پھر پریم یا محبّت تو کیا کرتے اپنے پاس ٹھہرنے بھی نہیں دیتے، لیکن انسان کی محبّت اپنی اولاد۔ اپنے بہن بھائی یا دوست احباب سے چند روزہ یا کسی خاص وقت تک نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی زندگی کا ایک جوہر ہوتی ہے اور جیسے جیسے انسان بوڑھا ہوتا رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کمزور اور طاقت گھٹتی رہتی ہے۔ دماغ اور ذہن میں بھی فرق آتا رہتا ہے۔ مگر آل اولاد اور کنبہ قبیلہ کی محبت گھٹنے کے بجائے بڑھتی رہتی ہے۔ گائے، بیل اپنی اولاد کو پہچانتے بھی نہیں مگر انسان کو اپنی اولاد سے زیادہ اولاد کی اولاد سے محبت ہوتی ہے یہ انسان کی خصوصیت ہے جو انسان کے مفہوم میں داخل ہے مگر اس کو حقیقت نہیں کہا جاتا۔

علمارِ فلسفہ جن کا دعویٰ ہے کہ وہ چیزوں کی حقیقتوں کو جانتے ہیں اور فلسفہ کا مقصد بھی یہی بتاتے ہیں کہ اس سے چیزوں کی حقیقت دریافت کی

جاتی ہے وہ انسان کی حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایسا جاندار ہے جس میں ادراک[1] کی قوت ہو۔ ان کے الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ انسان نام ہے "حیوان ناطق" کا۔

منطقی حضرات اس کو بڑے زور سے بیان کرتے ہیں مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ایک نامکمل اور نا تمام حقیقت ہے کیونکہ اس تعریف کی رو سے انسانیت کا مدار صرف دو چیزوں پر رہ جاتا ہے۔ جان دار ہونا اور ادراک کی طاقت۔ باقی رہے اخلاقی اور روحانی کمالات جو انسانیت کے اصلی جوہر ہیں قطعاً نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

فلسفی اور منطقی تعریف کی بنا پر ایک منکر خدا۔ بدکار۔ ظالم۔ شرابی۔ کبابی اور ایک خدا پرست۔ پرہیزگار۔ رحم دل۔ انصاف پرور۔ خلق خدا کا ہمدرد دونوں کا درجہ برابر ہے۔ کیونکہ دونوں حیوان ناطق ہیں بلکہ اگر اس بدکار منکرِ خدا نے تحقیقات زیادہ کرلی ہے مثلاً کچھ چیزیں اس نے دریافت کرلی ہیں یا کوئی نئی تھیوری پیش کردی ہے تو وہ بڑے درجہ کا ناطق ہوگا۔ اس کا مرتبہ بڑھا ہوا ہوگا۔

ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں مست رہتا ہو۔ واقعات اور محاورات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور میاں ظریف اور متین آپ نے یہ فرمایا کہ انسان قدرت کا لاڈلا اور دست قدرت کا شاہکار ہے۔ یہ بھی ٹھیک۔ قدرت کا لاڈ پیار تو آنکھوں کے سامنے ہے۔ قدرت کی تمام گل کاریاں اور دل نوازیاں اسی کے لئے ہیں اور شاہکار ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خود اس کے پیدا کرنے والے

---

[1] ادراک۔ دریافت کرلینا۔ کھوج نکال لینا۔

اللہ رب العالمین نے چار چار قسمیں کھا کر فرمایا ہے۔

"بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو بہتر سے بہتر انداز پر"

لیکن اس سے اللہ تعالیٰ کے انعام اور احسان کا پتہ چلتا ہے۔ یہ پھر بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کی حقیقت اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ کیونکہ اگرچہ ... پر لاڈ پیار اپنی اولاد سے ہی ہوتا ہے۔ مگر تم نے یہ بھی سنا ہوگا کہ محمود غزنوی جو ... بادشاہ تھا اُس کا لاڈلا اس کا ایک غلام تھا جس کا نام ایاز تھا۔ تم نے یہ ... بھی دیکھا ہوگا کہ جن کے اولاد نہیں ہوتی وہ کسی عزیز کا بچہ لے کر پالتے ہیں اور اپنی اولاد سے زیادہ اس سے لاڈ پیار کرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو کبوتروں، بٹیروں اور بعض کو کتوں سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے جیسی اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ پس جس سے لاڈ کیا جائے وہ اپنا بچہ بھی ہوسکتا ہے جو اس کے بعد جانشین ہوگا اور غلام بھی ہوسکتا ہے اور اپنی جنس کا بھی ہوسکتا ہے اور غیر جنس کا بھی جو اس کا کسی صورت سے بھی نائب یا جانشین نہیں بن سکتا پس لاڈلے ہونے سے نہ حقیقت معلوم ہوتی ہے نہ حیثیت معین ہوتی ہے۔

اور میاں "ابوالہول"، تمھارا نام خود ہولناک ہے۔ تمھیں انسان کی ہول ... کی ہی کا احساس ہوا کہ وہ ظالم اور جاہل ہے۔ شاید تمھیں قرآن شریف کی ایک ... آیت کا یہ ٹکڑا یاد آیا ہوگا "اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا" مگر ان خرابیوں ... کے پردہ میں جو خوبیاں ہیں ان پر تمھاری نظر نہیں پڑی۔

عزیز من۔ یاد رکھو۔ عادل اور منصف ... وہی ہوسکتا ہے جو ظالم بھی بن سکے۔ عالم وہی ہوسکتا ہے جو جاہل رہا ہو۔ جو ... ہو سکتا ہے وہی سپید بھی ہوتا ہے

اور جس پر کوئی رنگ ہی نہ چڑھے وہ نہ سپید ہوگا نہ سیاہ۔ دیوار کو آپ نہ ظالم کہہ سکتے ہیں نہ عادل۔ آپ کا گھوڑا جو نہایت قیمتی ہے۔ اس کو آپ جاہل نہیں کہہ سکتے کیوں کہ وہ عالم نہیں بن سکتا۔ پس انسان کو ظالم اور جاہل کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں عدل اور علم کی صلاحیت موجود ہے اور آیت کا مطلب بھی یہی ہے کہ نوع انسان کو وحی سے اس لئے نوازا گیا کہ اس کا جہل اور ظلم ختم ہو اور عادل اور عالم بن سکے۔

استاد محترم نے آج بچوں کے خیالات معلوم کئے۔ غلطیوں کی اصلاح فرمائی اسی میں گھنٹہ ختم ہوگیا۔ سوال کا جواب آئندہ مجلس کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

تیسری مجلس

بچوں نے جو کچھ سوچا تھا۔ استاد محترم دوسری مجلس میں ہر ایک کا جواب دے چکے ہیں۔ بچے ہفتہ بھر استاد صاحب کے جوابات سوچتے رہے اور منتظر رہے کہ آئندہ مجلس میں حضرت استاد صاحب کیا جواب دیں گے۔

آج بدھ کا دن ہے۔ استاد محترم نے پہلے گھنٹہ میں حسب معمول دینیات کا سبق پڑھایا۔ سبق سے فارغ ہونے کے بعد بچوں سے فرمایا کل کو جمعرات ہے دینیات کے گھنٹہ میں آپ کے سوال کا جواب قرآن شریف کی آیتوں سے دیا جائیگا تم اپنے اپنے قرآن شریف لے کر آنا، اور دیکھو بے وضو قرآن شریف کو چھونا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا وضو کر کے آنا اور جب تک سبق ختم ہو با وضو رہنا۔

بچوں کے لئے یہ نئی بات بہت ہی دلچسپ تھی کہ ان کے سوال کا جواب قرآن شریف کی آیتوں سے دیا جائے گا۔ جمعرات کی صبح ہوئی تو ہر ایک بچہ نے وضو کیا۔ کسی نے غسل بھی کر لیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے قرآن شریف لئے ہوئے بڑے ادب سے درجہ میں حاضر ہوئے اور اپنی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھ گئے اور سامنے بنچ پر قرآن شریف رکھ لئے۔

استاد صاحب تشریف لائے۔ وہ خود بھی باوضو تھے۔ وہ پان کھانے کے عادی ہیں۔ مگر آج انھوں نے پان نہیں کھار کھا تھا۔ کیونکہ جب قرآن شریف سامنے ہو تو یہ بے ادبی ہے کہ پان کی گلوری منھ میں ہو اور بار بار منھ چلتا رہے۔

استاد محترم نے بچوں سے فرمایا: اٹھارہویں پارہ کا پہلا رکوع نکالو۔

چند آیتوں کے بعد اس میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ

اس آیت کے نیچے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ یہ ہے ۔

"ہم نے بنایا آدمی۔ چُن[1] لی مٹی سے[2]"

مطلب یہ کہ ہم سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ مٹی کے خاص خاص اجزا چن لئے۔ ان سے حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا بنایا گیا۔

حضرت استاد نے فرمایا۔ یہ انسان کی حقیقت کا ایک جزو ہے کہ اس کی پیدائش مٹی سے ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو وہ صورت عطا ہوئی جو سب سے بہتر صورت[3] ہے

---

[1] چن لی۔ یعنی چھنی ہوئی مٹی اور منتخب۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے سلالۃ کا ترجمہ خلاصہ فرمایا ہے۔ آپ کے ترجمہ فارسی کے الفاظ یہ ہیں: ہر آئینہ آفریدم از خلاصہ گل اور المفردات فی غریب القرآن میں ہے سلالۃ من طین اے من الصفو الذی یُسَلُّ من الارض واللہ اعلم بالصواب

[2] یہ مٹی جس سے یہ خلاصہ اور جوہر لیا گیا اس کی نوعیت دوسری آیتوں میں یہ ہے کہ۔ یہ چپکنے والی مٹی تھی۔ طین لازب (صافات) اس کو پانی میں تر کرکے اس کا خمیر اٹھایا گیا تھا اور اس کو سانا گیا تھا جس سے وہ کھن کھن بولنے لگی من صلصال من حما مسنون (سورہ حجر) وہ ایسی تھی جیسی کمہار کی سانی ہوئی مٹی ہوتی ہے۔ من صلصال کالفخار (سورہ رحمٰن)

[3] لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم سورہ تین۔ بر آئینہ آفریدم آدم را در نیکو ترین صورتے (حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ

پھر حضرت آدمؑ کی نسل کیسے چلی اور اس کی پیدائش کس طرح ہوئی ہے۔ اس آیت کے باقی حصہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی۔ مگر تم جیسے بچوں کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ لہذا اس کا ترجمہ بھی نہیں کیا جاتا۔

پھر مولانا نے فرمایا۔ بیشک انسان جاندار ہے۔ مگر عام جانداروں اور انسان میں پہلا فرق جسمانی لحاظ سے ہے۔ انسان کو "بہترین ساخت" احسن تقویم عطا ہوئی۔

پھر مولانا نے فرمایا۔ سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالےٰ نے وہ فرق اور خصوصی امتیاز بیان فرمایا ہے جو انسان کو نہ صرف جان داروں، بلکہ تمام کائنات سے ممتاز اور افضل قرار دیتا ہے۔ یعنی یہی آدم جس کا خمیر مٹی سے بنایا تھا اللہ تعالےٰ نے اس پر یہ لطف و کرم فرمایا کہ اس کو "خلافت" سے نوازا۔ پس یہ انسان کی حقیقت کا دوسرا جزو ہے اور یہ ایسا قابلِ فخر جزو ہے جو انسان کو صرف حیوانات سے نہیں بلکہ ساری مخلوقات سے حتیٰ کہ فرشتوں سے بھی ممتاز کر دیتا ہے۔

اب انسان کی حقیقت یہ ثابت ہوئی کہ انسان ایسی جاندار مخلوق ہے جس کو احسن تقویم[1] اور خالق کائنات کی طرف سے منصب خلافت عطا ہوا۔

یہاں ایک اور بات بھی سنیئے جس پر آپ کو تعجب بھی ہوگا اور ہنسی بھی آئے گی سورۂ بقر کے اسی رکوع میں ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو خبر دی کہ "مجھ کو زمین میں ایک نائب (خلیفہ) بنانا ہے"، تو فرشتوں کو اس اعلان پر بہت تعجب ہوا کیونکہ "انسان"، کے جو عیب "میاں ابوالہول" نے بیان فرمائے

---

[1] سب سے بہتر انداز۔ پیدائش کی سب سے اچھی ترتیب۔

تھے وہی ان کی نظر میں تھے۔

حضرت استاد نے فرمایا۔ بچو! تمھیں معلوم ہے کہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں یعنی یہ بات ان کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی موقع پر اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کریں۔ مگر اللہ تعالےٰ کے اس اعلان سے انھیں یہاں تک تعجب ہوا کہ انھوں نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا۔

"خداوندا اس میں کیا حکمت ہے کہ آپ اس کو نائب بنا رہے ہیں جو زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون خرابہ کرے گا حالانکہ جہاں تک تسبیح پڑھنے اور یاد خدا کا تعلق ہے تو ہم آپ کی خوبیوں کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں اور آپ کی پاک ذات کو ہمیشہ یاد کرتے رہتے ہیں۔"

خداوند عالم نے اس وقت تو فرشتوں کو یہی جواب دے دیا کہ تمھیں میری حکمتوں کا علم نہیں ہے (اس لئے ایسی بات کہہ رہے ہو) پھر اپنی حکمت کا مظاہرہ اس طرح فرمایا کہ :۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھلا دیئے۔ پھر چیزیں سامنے رکھ کر فرمایا۔ بتاؤ ان کے نام کیا ہیں۔

نام تو فرشتوں کو بھی یاد تھے، مگر یہ بات کہ کس چیز کا کیا نام ہے فرشتے نہیں بتا سکتے تھے کیونکہ ان کو یہ بات نہیں بتائی گئی تھی۔ فرشتوں نے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں اپنا عذر پیش کر دیا کہ اللہ میاں ہمیں صرف وہی معلوم ہے جو آپ نے بتا دیا ہے۔ البتہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے یہ ذہن عطا فرمایا

تھا کہ حضرت آدم نے ان کے نام بتا دیئے۔ یہ بہت بڑی ذہانت کی بات تھی کہ مثلاً یہ بتا دیا کہ۔ درخت یہ ہے۔ پھول یہ ہے۔ پھل یہ ہے۔

یہی وہ علم تھا جس کے امتحان میں فرشتے ناکام رہے اور حضرت آدم علیہ السلام کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد اللہ تعالٰے نے حضرت آدم علیہ السلام کی کامیابی کا اعلان اس طرح کیا کہ تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ:

آدم علیہ السلام کے سامنے آداب بجالائیں

تمام فرشتوں نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن شیطان نے سرکشی کی کہ آدم مٹی کا بنا ہوا ہے اور میری پیدائش آگ سے ہوئی ہے۔ آگ مٹی کے سامنے نہیں جھک سکتی۔

یہاں آگ اور مٹی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسئلہ تھا، حکم خداوندی کی تعمیل کا۔ شیطان نے تعمیل کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔

حضرت استاد نے فرمایا۔ قرآن شریف کے شروع ہی میں یہ آیتیں موجود ہیں جن میں انسان کی حیثیت واضح کر دی گئی ہے کہ وہ زمین میں اللہ کا نائب ہے اور یہ نیابت اس کو اس لئے عطا ہوئی کہ اس کو علم عطا ہوا۔ یس یہ علم ایسی دولت ہے جس کی وجہ سے انسان کا درجہ فرشتوں سے بڑھ گیا۔

اس کے بعد استاد محترم نے فرمایا۔ سورۂ اعراف کا بائیسواں رکوع نکالو جو نویں پارہ کے نصف کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس رکوع میں فرمایا گیا ہے۔

" اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہونے والی تمام

ذرّیت کو اپنی بارگاہ میں حاضر کیا اور خود اُن سے اپنے رب ہونے کا اس طرح اقرار کرایا کہ اُن سے کہا کہ

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ　کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں۔

سب نے جواب دیا۔ بیشک۔ آپ ہم سب کے رب اور پروردگار ہیں۔ [1]

استاد صاحب نے فرمایا۔ خلیفہ اور نائب سے حلف وفاداری لیا جاتا ہے۔ اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو جب یہ بلند مرتبہ عطا فرمایا گیا تو اس سے عہد بھی لیا گیا اور ہر ایک انسان نے یہ عہد کیا۔ اس عہد کو عام محاورہ میں عہدِ الست کہتے ہیں۔

ان آیتوں کا مطلب بتانے کے بعد استاد محترم نے فرمایا۔ اب سمجھو انسان کی حقیقت یہ ثابت ہوئی کہ وہ ایسی جان دار مخلوق ہے جو اپنی صورت

---

[1] اس آیت کا باقی حصّہ یہ ہے کہ یہ اقرار اس لئے کرایا کہ قیامت کے روز یہ عذر نہ کر سکیں کہ ہمیں اس کی خبر نہیں تھی یا یہ کہ شرک کی ذمہ داری ہمارے باپ دادوں پر ہے جو پہلے سے مشرک تھے۔ ہم تو ان کے بعد ان کی ذرّیت تھے جو دین اور مذہب کے بارے میں ان کے تابع رہے۔ پس اصل مشرکوں کو سزا ملنی چاہئے، جنھوں نے دیکھا دیکھی شرک کر لیا ان کی گرفت نہ ہونی چاہئے۔

مقصد یہ ہے کہ دین کا معاملہ ایسا نہیں ہے جس میں باپ دادوں کی تقلید درست ہو۔ ہر شخص ذمہ دار ہے۔ باپ دادوں کا حوالہ دے کر یہ نجات نہیں پا سکتے۔

اور اپنی سیرت میں تمام کائنات سے ممتاز ہے۔

اس کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنے پروردگار کا خلیفہ اور نائب ہے جس نے اپنے رب سے وفادار رہنے کا عہد کیا ہے۔

استاد صاحب نے فرمایا۔ جو باتیں آج بتا دی گئی ہیں انھیں یاد رکھو اُن پر غور کرو۔ خوب سوچو اور سمجھو۔ پھر اگر کچھ باتیں پوچھنی ہوں تو اگلے ہفتہ جمعرات کی مجلس میں دریافت کرو۔ یہ بہت ضروری باتیں ہیں۔ یہ سمجھو کہ یہ باتیں ایک طرح کا سانچہ ہیں۔ پوری زندگی اسی سانچہ میں ڈھلتی ہے۔ اس میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو پوری زندگی کا سانچہ بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ بگڑا ہوا سانچہ دوزخ کا ایندھن ہوتا ہے۔

چوتھی مجلس

بچے سمجھے ہوئے تھے کہ آج کی مجلس بڑی پُر لطف ہوگی۔ بچے سوال کریں گے اور استاد صاحب جواب دیں گے۔ سوال اور جواب سب ہی عجیب ہوں گے۔

گھنٹی بجی۔ طلبہ درجہ میں پہنچے۔ جناب استاد محترم تشریف لائے، بچوں نے کھڑے ہوکر بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ جب استاد اور شاگرد درجہ میں بیٹھ گئے تو میاں "ابوالہول" کھڑے ہوئے اور نہایت ادب سے حضرت استاد کی خدمت میں عرض کیا۔

جناب والا آج کا یہ وقت سوالات کے لئے رکھا تھا۔ جناب والا جواب دیں گے۔ اگر اجازت ہو تو سوال پیش کر دوں۔

استاد محترم: میاں ابوالہول۔ آپ کی بات پکی ہے۔ بیشک آج کا یہ وقت سوالات کے لئے ہے۔ آپ خوشی سے سوال کیجئے۔ انشاء اللہ جواب دیا جائے گا۔

ابوالہول۔ حضرت یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ حضرت انسان ہی کو خلافت کیوں ملی۔ یہ درست ہے کہ انسان کو علم عطا ہوا جو خلافت کے لئے ایک بنیاد[1] کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یہ تو خدا کے دین کی بات ہے۔ وہ علم فرشتوں کو بھی دے سکتا ہے۔ علم جیسی دولت کے لئے اسی کو کیوں منتخب فرمایا

---

[1] کما یشیر اللہ قولہ تعالیٰ فی قصہ طالوت انہ زادہ بسطۃ فی العلم والجسم (سورہ بقرہ)

جس کا کام قتل و خون اور فساد ہے۔

استاد محترم۔ انسان کو علم اس لئے عطا ہوا کہ اس کو "احسن تقویم" عطا ہوا تھا۔ یعنی اس کی ساخت اور بناوٹ سب سے بہتر تھی۔ خالق کائنات نے اس کو ایسے انداز سے بنایا ہے جو بہت ہی موزوں ہے۔ تمھارے ایک ساتھی نے ٹھیک کہا تھا کہ انسان دست قدرت کا شاہکار ہے"

اور تم تو قرآن شریف پڑھتے ہو۔ سورہ تین میں اللہ تعالیٰ نے چار مرتبہ[1] قسم کھا کر فرمایا ہے" لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (بلاشبہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان کو ہم نے بہت ہی بہتر انداز میں پیدا کیا ہے" [2]

---

[1] ان قسموں کے جو لطائف اور فوائد بیان کئے گئے ہیں ان میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ان میں ان مقامات کی طرف اشارہ ہے جو مہبط وحی رہے۔ انجیر اور زیتون بیت المقدس کے قریب تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ بیت المقدس کے آس پاس دو باغ تھے انجیر کے اور زیتون کے۔ بیت المقدس بنو اسرائیل کے تقریباً تمام دور میں انبیاء علیہم السلام کا قیام گاہ اور مستقر رہا جن پر وحی نازل ہوتی رہی۔ طور سینین سے وہی طور مراد ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالےٰ نے خطاب فرمایا اور پھر "لن ترانی" کے دلکش جواب نے تو اس کو یہاں تک مشہور کر دیا ہے کہ فارسی اور اردو کے شعراء تک طور کا ترانہ گاتے ہیں۔ بلد امین سے مکہ معظمہ مراد ہے۔ پس ایسے مقامات کی طرف اشارہ کرکے" لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" فرمایا گو اس طرف اشارہ ہے کہ "وحی الٰہی" اور "علم" جیسی دولت اسی کو کیوں عطا ہوئی۔ واللہ اعلم [2] آیت میں تاکیدی حروف ہیں۔ یعنی لام تاکید، پھر قد، پھر صیغہ ماضی سے جملہ کا آغاز۔ ان تاکیدات کے پیش نظر یہ ترجمہ کیا گیا۔

چار دفعہ قسمیں کھا کر جو اس پختگی سے یہ بات فرمائی گئی تو شاید اسی سوال کا جواب
دینا مقصود ہے کہ علم جس پر خلافت کا مدار ہے وہ انسان ہی کو کیوں عطا ہوا۔

عزیز من۔ شمع کانچ کے قندیل ہی میں روشن کی جا سکتی ہے۔ نہ سونے
چاندی کا ڈبہ اس کے لئے موزوں ہے۔ نہ ریشم اور حریر کے کسی غلاف میں یہ لپیٹی
جا سکتی ہے۔ کانچ کا ٹکڑا اگرچہ آپ کے ہاتھ کو زخمی کر دیتا ہے مگر اس کا کیا علاج
کہ شمع کے لئے وہی موزوں ہے[۱]

انسان اگرچہ فساد بھی پھیلاتا ہے۔ مگر یہ صلاحیت بھی اسی میں ہے کہ
وہ برائی چھوڑ کر بھلائی اختیار کر سکے۔ پستی سے اٹھ کر بلندی کی طرف ترقی کر سکے
یہ دنیا دارِ عمل ہے۔ ترقی کرنے کی جگہ ہے۔ لہٰذا اس کی نیابت کے لئے بھی وہی
موزوں تھا جس کی زندگی کا مقصود عمل اور ترقی ہو۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو توفیق
بخشے کہ گناہوں کی پستیوں سے نجات پائیں اور آخرت کے اعلیٰ اور بلند مراتب

۱؎ دنیا دار عمل ہے دارِ جزا نہیں۔ یہاں ترقی اور تنزل کے دونوں چکر چلتے ہیں۔ پس
اس ماحول کے مناسب وہی ہو سکتا ہے جس میں ترقی اور تنزل دونوں کی صلاحیتیں ہوں
ان دونوں صلاحیتوں کی طرف سورۂ تین میں اشارہ فرمایا گیا ہے پس اس دارِ عمل میں نیابت
و خلافت کے لئے وہی موزوں ہو سکتا ہے جو خود اپنی زندگی کے لحاظ سے بھی اس دور میں
ہو جس میں عمل مقصود ہے۔ انسان کی حیات کا آغاز عہد الست سے ہوتا ہے وہ اپنی منزلیں
طے کرتے ہوئے اس عالم میں اس لئے آتا ہے کہ وہ عمل کی کھیتی بو سکے۔ جس کو وہ مرنے کے
بعد کاٹے گا۔ پس جیسے یہ دنیا دار عمل ہے، دار امتحان اور مزرعۃ الآخرت ہے اسی طرح اس
میں خلافت و نیابت اس کو مل سکتی ہے جس کا مقصود حیات عمل اور سراسر عمل ہے۔

کی طرف ترقی کرسکیں۔

حضرت استاد محترم نے جیسے ہی بیان ختم فرمایا۔ میاں متین نے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت استاد نے فرمایا۔ ضرور آپ بھی فرمائیے۔

متین: حضرت یہ تو معلوم ہوگیا کہ انسان کو خلافت اس لئے عطا کی گئی کہ اس کو "علم" عطا ہوا۔ اور علم اس لئے عطا ہوا کہ اس کو "احسن تقویم" عطا ہوا ہے۔ اس میں ترقی کی صلاحیت ہے۔ وہ جانوروں کی خصلتوں سے بلند ہوکر فرشتوں کی خصلتیں اختیار کرسکتا ہے۔ جہل اس میں ہے مگر یہ صلاحیت بھی ہے کہ علم حاصل کرسکے۔ ظلم کو چھوڑے اور منصف بن سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ صرف اعتقادی بات ہے کہ انسان کو خلافت عطا ہوئی۔ یا کوئی ایسی شہادت بھی ہمارے سامنے ہے جس سے معلوم ہو کہ انسان واقعی زمین میں اللہ کا نائب ہے۔

حضرت استاد مدظلہ العالی۔ آپ کے ساتھی ظریف نے کہا تھا کہ انسان قدرت کا لاڈلا ہے۔ قدرت کی جس چیز کو چاہے اپنے قبضہ میں لے کر جو چاہتا ہے وہ کام اس سے لیتا ہے۔ غالباً میاں ظریف سمجھتے ہیں کہ یہ انسان کی دھاندلی ہے یعنی اس کو اس کا اختیار ملا ہوا نہیں ہے وہ بلا اختیار اپنی زبردستی سے یہ دست درازی کرتا ہے جیسے لاڈلے اور شوخ بچے بلا اجازت گھر کی چیزوں کو خراب کیا کرتے ہیں اور یہ میاں ظریف کی بات نہیں ہے بلکہ سائنس والے بھی یہی سمجھتے ہیں کہ قدرت ہماری حریف[1] اور یہ ہماری چالاکی اور ہوشیاری ہے

---

[1] حریف۔ مدمقابل۔ مخالف

کہ قدرت نے جن چیزوں کو ہم سے چھپا رکھا تھا ہم ان کو قدرت کے علی الرغم[1] معلوم کرتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں مگر جب کلام پاک نے یہ بتایا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت سے نوازا ہے۔ اس نے یہ بھی بتادیا کہ جس طرح خلیفہ کو اختیارات ہوا کرتے ہیں ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے بھی اس عالم کی تمام کائنات[2] پر انسان کو اختیارات عطا فرما دیئے ہیں اور اس کو اجازت دے دی کہ زمین، پہاڑ، دریا، سمندر، فضاء آسمانی اور تحت الثریٰ[3] کے پوشیدہ خزانوں میں سے جس کو چاہے قبضہ میں لائے اور اپنا کام اس سے نکالے اور جہاں تک وہ ترقی کرسکتا ہے ترقی کرتا رہے۔ سورہ جاثیہ میں ارشاد ہوا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (ع ۲)

مسخر کردیا تمھارے لئے (تمھارے قابو میں کردیا) جو کچھ آسمانوں میں

ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سب کا سب اپنی جانب سے

اس مضمون کی آیتیں قرآن پاک میں جگہ جگہ آئی ہیں۔

پس یاد رکھو خلیفہ بنانے والا خداوند تعالیٰ ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے اس کا ہر ایک فعل کامل و مکمل ہوتا ہے پس اس نے جو خلافت عطا فرمائی وہ بھی

---

[1] رغم۔ مٹی میں ناک رگڑنا۔ علی الرغم۔ مٹی میں ناک رگڑنے اور ذلیل کرنے کے باوجود مختصر یہ کہ علی الرغم کے معنی ہیں مرضی کے خلاف۔ [2] کائنات میں پیدا ہونے والی چیزیں یعنی موجودات۔ [3] تحت کے معنی نیچے اور ثریٰ نمناک اور گیلی مٹی۔ جب زمین کھودی جاتی ہے تو پہلے نمناک مٹی نکلتی ہے جیسے پانی میں بھیگی ہوئی ہو۔ پھر کیچڑ نکلتا ہے پھر پانی وغیرہ نکلتا ہے۔ تحت الثریٰ کا مطلب یہ ہے کہ نمناک مٹی یا کیچڑ کے نیچے جو کچھ ہے مثلاً تیل۔ پٹرول وغیرہ۔

کامل و مکمل عطا فرمائی۔ ادھوری خلافت نہیں بخشی۔

ھمایوں: حضرت آج کی گفتگو میں بہت سی باتیں معلوم ہوگئیں اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ ہم ان کو یاد رکھیں۔ ایک بات مجھے بھی دریافت کرنی ہے اجازت ہو تو عرض کروں۔

حضرت استاذ: ضرور۔

ھمایوں: آپ نے یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو حکم کیا کہ آدم علیہ السلام کے لئے آداب بجالائیں۔ مگر قرآن پاک میں صاف یہ ہے کہ فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کریں میرا سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ جائز ہے ؟

استاذ صاحب: بیشک خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ لیکن جب خدا جو معبود اور مسجود حقیقی ہے[۱]۔ اس کا حکم ہی یہ ہو کہ ان کو سجدہ کرو تو اب چون و چرا غلط ہے۔ کیونکہ حکم کی تعمیل ضروری ہوتی ہے[۲]۔ حکم کے مقابلہ میں چون و چرا گستاخی اور سرکشی ہوا کرتی ہے اور اس کے معنی علماء نے یہ بھی فرمائے ہیں کہ سجدہ کرو آدم کی طرف۔ گویا اصل سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔ البتہ جیسا نماز میں سجدہ کے لئے قبلہ کا رخ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو اس وقت فرشتوں کے لئے قبلہ بنا دیا تھا کہ ان کی طرف رُخ کر کے سجدہ کریں۔ ○

---

[۱] یعنی اس کا حق ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے پس اگر اس نے کسی کے متعلق یہ حکم کیا کہ اس کو سجدہ کیا جائے تو صاحب حق نے اپنا حق دوسرے کو دیا۔ صاحب حق کو اس کا اختیار ہوتا ہے [۲] بشرطیکہ حکم جائز ہو اللہ میاں اگر کسی کو سجدہ کا حکم کریں تو یہ ان کا حکم برمحل ہوگا کیونکہ سجدہ جو ان کا حق ہے وہ اس کے متعلق اجازت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے علاوہ کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی کو سجدہ کرنے کا حکم کرے اگر وہ ایسا حکم کرتا ہے تو یہ اس کا حکم بے محل اور قطعاً غلط ہے۔

پانچویں مجلس

آج جیسے ہی مدرسہ کا وقت شروع ہوا اور استاد اور شاگرد درسگاہ میں جمع ہوئے۔ جماعت کا وہ ہونہار طالب علم جس کا نام مجیب ہے استاد محترم کے سامنے ادب سے کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا۔

خلافت آدم کا جو مسئلہ چل رہا ہے اور اس مسئلہ میں جناب نے جو تقریر فرمائی تھی اس کے متعلق چند سوالات گزشتہ جمعرات کو پیش کئے گئے تھے جن کے جوابات جناب نے ارشاد فرمائے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک بات مجھے بھی دریافت کرنی تھی۔ گزشتہ ہفتہ وقت ختم ہوگیا تھا اس لئے یہ خادم اپنا سوال پیش نہیں کر سکا تھا۔ اگر اجازت ہو تو اس وقت اپنا سوال عرض کروں۔

جناب استاد : ضرور پیش کرو۔

مجیب : حضرت معاف فرمائیں۔ بظاہر شیطان کی یہ بات تو معقول تھی کہ میری پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور آدم کی پیدائش مٹی سے۔ آگ کا مرتبہ مٹی سے بڑھا ہوا ہے۔ پس بلند مرتبہ والے کو پست کے سامنے سجدہ کرنا زیب نہیں دیتا۔

حضرت استاد : یعنی خدا کے حکم کے سامنے اس نے عقلی گھوڑے دوڑائے اس کا نام عقل پرستی ہے۔ اس طرح انسان بھی عقلی گھوڑا دوڑائے تو کہہ سکتا ہے کہ ہم کعبہ کی طرف سجدہ نہیں کرتے کیونکہ کعبہ پتھروں کا بنا ہوا ایک کمرہ ہے۔ انسان کا درجہ پتھروں سے بلند ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ قبلہ دراصل وہ

فضا ہے جو اس کمرہ میں چار دیواری سے گھری ہوئی ہے تو فضا کے متعلق بھی انسان یہی کہہ سکتا ہے کہ فضا میں نہ کوئی کمال ہوتا ہے نہ خوبی۔ اس کے برخلاف انسان میں کمال ہی نہیں بلکہ بہت سے کمالات ہوتے ہیں۔ لہذا انسان کا درجہ بڑھا ہوا ہے پھر شیطان کی یہ دلیل بھی قطعاً غلط تھی کہ آگ کا درجہ مٹی سے بڑھا ہوا ہے اس نے یہ کیسے سمجھ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ آگ کا درجہ بلند ہے یا خود شیطان کا خیال تھا۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے کہیں نہیں فرمایا۔ یہ خود شیطان کا اجتہاد تھا جو قطعاً غلط تھا۔ کیونکہ جس طرح مٹی خدا کی پیدا کی ہوئی ایک مخلوق ہے آگ بھی ایک مخلوق ہے۔ خالق کے سامنے مخلوق مخلوق سب برابر اور اگر مان لیں کہ بالغرض آگ کا درجہ مٹی سے بڑھا ہوا ہے تو کیا گھٹیا کو جائز ہے کہ وہ بڑھیا کو سجدہ کرے ظاہر ہے ایک پرہیزگار کا درجہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بدکار گنہ گار سے بڑا ہے، عالم کا درجہ جاہل سے، باپ کا درجہ اولاد سے شوہر کا درجہ بیوی سے بڑھا ہوا ہے تو کیا ان چھوٹوں کو جائز ہے کہ بڑوں کو سجدہ کریں، شیطان کی دلیل اگر مانی جائے تو پھر گھٹیا کے لئے لازم ہونا چاہئے کہ بڑھیا کو سجدہ کرے حالانکہ اللہ کے علاوہ کسی کو بھی سجدہ جائز نہیں۔ انتہا یہ کہ امتی کو جائز نہیں کہ وہ اپنے نبی کو سجدہ کرے۔ حالانکہ نبی کا درجہ خدا کے بعد سب سے بڑا ہوتا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

رشید: قرآن شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا اور اولاد آدم نے اقرار کیا کہ اللہ تعالے ہمارا رب ہے مگر یہ عہد تو ہمیں یاد نہیں پھر ہم پر اس کی پابندی کیوں ضروری ہے۔

استاد صاحب: یاد نہ رہنے سے پابندی ختم نہیں ہو جاتی۔ مثلاً آپ نے کسی سے قرض لیا اور بھول گئے تو کیا اس سے وہ قرض معاف ہو جائے گا۔

کسی نے آپ پر احسان کیا۔ آپ بھول گئے۔ یہ احسان فراموشی ہوگی جو عیب ہے ہنر نہیں اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے سیکھنے اور سمجھنے کا وقت اور اس کی کیفیت یاد نہیں ہوتی مگر ذہن میں وہ ایسی ہوتی ہے جیسے پتھر کی لکیر۔ اور اس سے یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ کسی نے ان کو سکھایا تھا۔ کسی وقت ان کو سیکھا تھا۔ مثلاً الف۔ با۔ تا۔ آپ نے کس وقت پڑھا تھا۔ کس نے پڑھایا تھا۔ کس طرح پڑھایا تھا۔ اکثر بچوں کو قطعاً یاد نہیں ہوتا۔ مگر الف۔ با۔ تا ذہن میں جما ہوا ہوتا ہے تو بچہ کو ماننا پڑتا ہے کہ استاد نے اس کو یہ حرف پڑھائے تھے اور اس نے پڑھے تھے۔ اسی طرح "عہد الست"، کی کیفیت ہمیں یاد نہیں رہی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار تو ہمارے ذہنوں میں پتھر کی لکیر بنا ہوا ہے۔ ہر انسان فطرتاً مانتا ہے کہ اُس کا رب ہے۔ بیشک کچھ شریر نوجوان معاذ اللہ خدا کے وجود کا انکار کر بیٹھتے ہیں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے بہت سے شریر نوجوان ماں باپ کے حق میں بے ادبی کرتے ہیں اور ان کا احسان ماننے سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ان کا دل خود ملامت کرتا ہے اور خود سمجھتے ہیں کہ ہم غلط کر رہے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی مصیبت کا وقت آتا ہے تو جس طرح بے اختیار ماں باپ یاد آجاتے ہیں ایسے ہی بے اختیار ہوکر زبان سے اپنے رب اور خدا کی دوہائی نکلتی ہے۔ یہ تمام باتیں دلیل ہیں کہ عہد انسان نے ضرور کیا اور اب جس طرح خود اپنی پیدائش اپنی ماں کا دودھ پلانا اور بچپن میں باپ کا چمکارنا اور گود میں لے کر سیر کرانا ہمیں

یاد نہیں۔ وہ عہد بھی یاد نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی پابندی بھی ہم پر ضروری نہیں خصوصاً جب انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ وہ عہد یاد دلا دیا گیا تو اس کی پابندی اور بھی زیادہ ضروری ہو گئی۔

مسعود۔ مسعود صاحب نے نہایت ادب سے عرض کیا۔ حضرت ایک بات میں بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ جب انسان خلیفہ ہے تو کیا ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اپنے آپ کو فرشتوں سے افضل سمجھیں۔

حضرت استاد صاحب: میاں مسعود۔ پہلی بات تو یہ سمجھو کہ مخلوقات میں یہ قسم جس کو انسان کہتے ہیں۔ اس قسم کو افضل قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً پھلوں میں سیب کی قسم امرود سے افضل ہے۔ اب یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے کہ کوئی سیب بہت ترش ہوتا ہے۔ کسی سیب میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو ظاہر ہے کھٹا۔ ترش یا کیڑے پڑا سیب امرود سے بہتر نہیں مانا جائے گا اگرچہ سیب کی قسم امرود کی قسم سے بہتر اور افضل ہے۔ دوسری بات یہ یاد رکھو کہ خود خلیفہ کی عظمت اور بڑائی بھی وفاداری پر موقوف ہے۔ بے وفا خلیفہ صرف مجرم ہی نہیں بلکہ باغی ہے۔ باغی کسی سے افضل اور قابلِ تعظیم تو کیا ہوتا سب کی نظروں سے گرا ہوا ہوتا ہے اس کا مستحق ہوتا ہے کہ اس کی گردن ماردی جائے۔

جہاں تک وفاداری کا تعلق ہے تو انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ اپنے رب اور آقا کے وفادار ہوتے ہیں۔ وہ لا محالہ فرشتوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام انسانوں

کی وفاداری کا حال اللہ تعالےٰ کو خوب معلوم ہے۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بتادیا ہے کہ کوئی شخص تقویٰ میں جتنا بڑھا ہوا ہے اتنا ہی زیادہ خدا کے یہاں باعزت ہے۔ البتہ اس درجہ پر اپنے آپ کو افضل ماننا ہر ایک انسان کا فرض ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی یہ عزت نہ دے کہ وہ اس کے سامنے سجدہ کرنے لگے۔ خواہ فرشتہ ہو یا جنات یا خود انسان ہی ہو۔ خدا کے سوا کسی کی بھی نہ پوجا درست ہے نہ سجدہ درست۔

حضرت استاد نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مشت[1] خاک کو خلافت سے نوازا اور وہ درجہ عطا فرمایا کہ اس کو صحیح طور پر اشرف المخلوقات[2] کہا جاتا ہے۔ مگر یہ منصب اور یہ اعزاز جس طرح ہمارے لئے باعث فخر ہے اسی طرح اس کی کچھ ذمہ داریاں، اس کے کچھ مطالبات اور تقاضے بھی ہیں جن کا پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ آئندہ مجلس میں انشاء اللہ خلافت کے تقاضے اور خلیفہ کے فرائض پیش کئے جائیں گے۔ آپ سب اپنی کاپیاں ساتھ لائیں اور جو کچھ بتایا جائے اس کو قلمبند کرلیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔

○

---

[1] مشت۔ مٹھی۔ مشت خاک۔ خاک کی مٹھی

[2] اشرف المخلوقات۔ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ شریف

چھٹی مجلس

خلافت کے تقاضے اور خلیفہ کے فرائض

مدرسہ کا وقت شروع ہوا۔ طلبار حاضر اور استاد صاحب تشریف فرما ہوئے۔ حضرت استاد نے طلبار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا

جیسا کہ پہلی مجلس میں اعلان کیا گیا تھا۔ آج کی مجلس میں خلافت کے تقاضے اور خلیفہ کے فرائض بتائے جائیں گے۔ آپ قلم بند کرلیں۔

خلافت کے تقاضے

(۱) خلافت کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ اپنے مالک اور آقا کا وفادار اور فرماں بردار رہے۔ جو حکم ہو اس کی بلا چون وچرا تعمیل کرے اس کی سمجھ میں نہ آئے تب بھی تعمیل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۲) صرف اپنے مالک کا ہو کر رہے۔ ان کے سامنے ہرگز ہرگز نہ جھکے جو اس کے آقا کے حریف اور مقابل مانے جاتے ہیں۔

عزیزو! خوب سمجھو اس سے بڑھ کر اور غداری کیا ہو سکتی ہے کہ خلافت کی عزت تو بخشی اس اللہ تعالیٰ نے جو وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور انسان گردن جھکائے اس کے سامنے جو اس کا حریف ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ ایک ہے اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ حریف ہے۔ یہ محض نفس کا دھوکا ہے کہ کسی کو

اس کا حریف ساجھی یا شریک مانا جائے اور اس کے نام کی بھینٹ چڑھائی جائے یا اُس کے نام کی مالا جپی جائے۔ یہ بھی یاد رکھو۔ اللہ ایک ہے۔ وہی معبود ہے اس کے سوا جس کا نام بھی لیا جائے وہ محض دھوکا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بار بار چیلنج کیا ہے کہ جن معبودوں دیوی دیوتاؤں کو تم مانتے ہو یا جن کو خدا کا بیٹا کہتے ہو اگر تمھارے پاس اس کا ثبوت ہو تو پیش کرو مگر دنیا آج تک نہ کوئی ثبوت پیش کر سکی ہے نہ کوئی دلیل لا سکی ہے۔

(۳) خلیفہ کا فرض ہے کہ ماتحت کو ماتحت سمجھے اس کو اپنا آقا نہ ماننے لگے۔ کیونکہ یہ مالک کے حق میں بے وفائی نہیں بلکہ خود اس کی بہت بڑی حماقت ہے کہ جو مخلوق خود اس کی ضرورت کے لئے یا اس کی خدمت کرنے کے لئے بنائی گئی ہے اس کو اپنا بڑا ماننے لگے اور اس کی پوجا پاٹ شروع کر دے۔

(۴) خلیفہ اپنے مالک کا اس طرح ہو کر رہے کہ ہر کام میں اس کی نگاہ اپنے مالک پر ہو۔ اپنے تمام کاموں کا مدار صرف اپنے مالک پر رکھے۔ مالک کی رضا میں راضی رہے اس کی خوشی وہ ہو جو اس کے مالک کی خوشی ہے۔ یہ اپنی چاہ اور اپنی خواہش مالک کی مرضی کے سامنے فنا کر دے یعنی اس کی چاہ کچھ نہ ہو۔ مالک کی چاہ اس کی چاہ بن جائے۔

(۵) ماتحتوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اس کے مالک کی مرضی ہو اور جس طرح کا برتاؤ مالک کا ہوتا ہے اسی کا نمونہ یہ بھی پیش کرے [۱]۔

---

[۱] اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ وہ بندوں کے ہزاروں گناہ دیکھتا ہے پھر بھی رحم و کرم سے کام لیتا ہے۔ یہی برتاؤ ہمارا ہونا چاہئے۔

(۶) جو ضابطہ یا قاعدہ اس کے مالک نے اس کے ماتحت یا اس کے برابر والوں کے لئے تجویز کر دیا ہے۔ ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق عمل کرے۔

(۷) مالک کے حکم کی تعمیل اور اس کی مرضی کو پورا کرنے میں جو مشکل بھی پیش آئے خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کرے۔

خلیفہ کے فرائض

عزیزو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی خلافت کی عزت بخشی ہے۔ پس تمہارا فرض ہے:۔

(۱) اپنے آقا کے شکر گذار رہو۔

(۲) اپنے مالک کے وفادار رہو۔

(۳) ہر وقت اس کی اطاعت کے لئے کمربستہ رہو۔ اس کے ہر ایک حکم کی سو جان سے تعمیل کرو۔ تمہاری سمجھ میں نہ آئے تب بھی تعمیل کرو۔ چون و چرا کرنا سرکشی ہے۔

(۴) مالک کی مرضی کو اپنی مرضی بنالو۔ اپنی چاہ ختم کر دو۔ مالک کی چاہ کو اپنی چاہ بنالو۔

(۵) اپنے برابر والوں اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہی معاملہ کرو ۔جو تمہارے مالک کا معاملہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ دیکھو تمہارا مالک رب العٰلمین اور ارحم الراحمین ہے یعنی تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا۔ سب کا پالنہار اور سب پر رحم کرنے والا اور سب مہربانوں سے زیادہ مہربان۔ پس تم بھی مربی ہو۔ خلق خدا کے

ہمدرد، غریبوں اور کمزوروں کے مددگار نہ صرف اپنے برابر والوں یعنی انسانوں کے لئے بلکہ ہر ایک جان دار کے لئے پیکر رحم بن جاؤ۔

تمہارا مالک بہت بڑا محسن ہے۔ تم بھی احسان کرو۔ جاننے والوں پر بھی احسان کرو۔ جن کو تم نہیں جانتے ان پر بھی احسان کرو۔

تمہارا آقا احکم الحاکمین ہے۔ یعنی سب حاکموں سے بڑا حاکم۔ وہ جتنا بڑا حاکم ہے اتنا ہی بڑا منصف بھی ہے۔ تم اس کے خلیفہ ہو، ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا تمہارا فرض ہے۔ اپنے پرایوں کے ساتھ انصاف کرو جو تمہارے دشمن ہیں ان کے ساتھ بھی انصاف کرو۔

تمہارے آقا اور مالک اللہ رب العالمین کا حکم ہے کہ جو تم سے کینہ اور بغض رکھتے ہیں۔ تمہارے دین کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں[1]۔ ان کے ساتھ بھی انصاف کرو۔ ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ اس کینہ بغض اور دشمنی کی وجہ سے تم کسی بھی موقع پر انصاف سے ہٹ جاؤ۔

تمہارا مالک حاجت روا اور کارساز ہے۔ تم بھی لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرو۔ بے بسوں کے مددگار اور اپنے بے نواؤں کے کارساز بنو۔

تمہارا مالک غفار ہے۔ اپنے بندوں کے بڑے سے بڑے گناہ بھی بخش دیتا ہے۔ تم بھی یہ خصلت اختیار کرو۔ اپنوں پرایوں کے ساتھ چشم پوشی سے کام لو، ان کی خطاؤں سے درگذر کرو۔

---

[1] قال اللہ تعالےٰ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قومٍ ان صدوکم عن المسجد الحرام الآیۃ۔ سورہ مائدہ ۔ شنان قوم علیٰ الا تعدلوا سورہ مائدہ ع ۲)

تمہارا مالک ستار ہے۔ بندوں کے گناہ دیکھتا ہے اور پردہ پوشی کرتا ہے۔ تمہارا بھی فرض ہے کہ دوسروں کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرو۔

مختصر یہ کہ رحیمی اور کریمی، غفاری اور ستاری کی جو شان ربّ العالمین کی ہے وہی تم بھی اختیار کرو۔ کیوں کہ تم اس کے خلیفہ اور نائب ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ

اللہ تعالیٰ کی خصلتیں تم بھی اختیار کرو

جناب اُستاد نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا۔ جب ان تقاضوں کو پورا کیا جاتا ہے تو توکل، تسلیم و رضا اور صبر و شکر وغیرہ جیسے اوصاف نمایاں ہوتے ہیں جو انسانیت کے کمالات مانے جاتے ہیں۔

اس تنگ وقت میں ان کو سمجھانا مشکل ہے۔ آئندہ مجلس میں ان کی تفصیل پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ
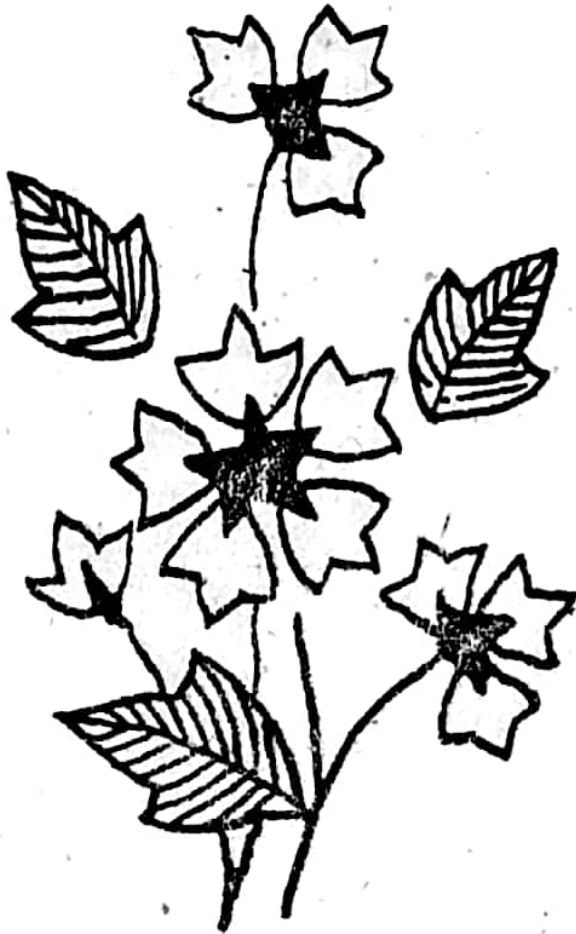
ساتویں مجلس

انسانیت کے کمالات

جمعرات کی صبح کو جیسے ہی گھنٹی بجی۔ جماعت کے تمام بچے بڑے شوق سے حاضر ہوئے کہ آج استاد محترم وہ اوصاف بیان فرمائیں گے جو انسانیت کے کمالات مانے جاتے ہیں۔ ہم ان کو قلم بند کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اُن پر عمل کر کے کامل انسان بن سکیں۔ اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

استاد محترم نے تقریر شروع کرتے ہوئے فرمایا:

تم پہلے پڑھ چکے ہو کہ خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ اپنے مالک کا ہو کر رہے۔ ہر موقع پر اور ہر حالت میں اس کی نگاہ اپنے مالک پر ہو۔ اپنے تمام کاموں کا مدار اپنے مالک پر رکھے۔

عزیزو! یہی معنی توحید کے بھی ہیں۔ یعنی تم اللہ کو ایک مانو۔ اسی کو اپنا مالک اور کارساز سمجھو اور اس کی مرضی پر اپنے تمام کاموں کا مدار رکھو۔

پیارے بچو! تمھارا مالک قادر مطلق ہے۔ احکم الحاکمین ہے۔ روزی عطا کرنا۔ مارنا جلانا، نفع یا نقصان پہنچانا۔ بیمار کرنا پھر شفا بخشنا اسی کا کام ہے۔ اپنی تمام ضرورتوں میں تم نظر اسی پر رکھو اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو اس کو عربی میں توکل کہا جاتا ہے۔ یعنی سپرد کر دینا اور ذمہ دار بنا دینا۔ جیسے مؤکل اپنے وکیل کو ذمہ دار بنا دیتا ہے۔ بلکہ جیسے دودھ پینے والے بچے کی نظر ہر

ضرورت کے وقت اپنی مہربان ماں پر رہتی ہے۔

تمہارا آقا اور مالک اللہ ربّ العالمین جس نے تمہاری ماں کے دل میں تمہاری تڑپ پیدا کی وہ ماں سے بھی بہت زیادہ تم پر مہربان ہے۔ پس تم اپنی تمام ضرورتوں میں اپنی نظر اسی پر رکھو۔ تم "متوکل" مانے جاؤ گے۔ مگر یہ بھی یاد رکھو کہ اس آقا اور مالک نے کوشش کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ہر کام میں اپنی سی کوشش اور محنت ہمارا فرض ہے۔ البتہ محنت اور کوشش کے ساتھ یہ بھی یقین رکھو کہ کوشش کو کامیاب کرنا اسی کا کام ہے۔

تم اگر کاشتکار ہو تو کھیت میں بیج ضرور ڈالو۔ وقت پر آبپاشی کرو۔ نیلاتے بھی رہو۔ پوری محنت سے اس کی حفاظت کرو۔ لیکن یہ بھی یقین رکھو کہ بیج کو پودا بنانا، پودے کو بڑھانا، اُس میں بال لگانا، بال میں دانہ ڈالنا اور دانے کو پکانا۔ یہ سب اسی کا کام ہے۔

تم اگر تجارت کرو تو پہلے وہ منڈیاں تلاش کرو جہاں سے مال سستا مل سکے۔ پھر مال اچھے سے اچھا منگاؤ۔ پوری طرح اس کی حفاظت کرو۔ اس کے لئے اشتہار دو۔ جائز طور پر پروپیگنڈا[1] کرتے رہو۔ مگر اس تمام کوشش کے ساتھ یہ بھی یقین رکھو کہ خریدار کو بھیجنا۔ اس کو مناسب قیمت ادا کرنے پر آمادہ کرنا یہ کام تمہارا نہیں یہ کام اس کا ہے جس کے ہاتھ میں بندوں کے دل ہیں۔ پس اپنی سی کوشش کرتے رہنا، نتیجہ خدا کے سپرد کرنا، نظر اپنی کوشش پر نہ رکھنا،

---

[1] غلط پروپیگنڈا یعنی اپنی چیزوں کی خوبیاں بڑھ چڑھ کر بیان کرنا یا مال کی جھوٹی تعریف کرنا ممنوع ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح برکت ختم ہو جاتی ہے اور جھوٹ کا گناہ سر پر رہتا ہے

بلکہ خدا پر رکھنا۔ یہ توکل ہے جو انسانیت کا کمال ہے۔

تمہارا بھروسہ خدا پر جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی زیادہ شان توکل بلند ہوگی اللہ تعالیٰ ہم سب کو توکل کی توفیق بخشے (آمین) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

تسلیم و رضا

عزیزو! تم پڑھ چکے ہو کہ خلیفہ کی سعادت مندی یہ ہے کہ اپنے آپ کو مالک کے حوالے کردے اس کا نام تسلیم ہے۔ یعنی سپرد کر دینا۔ مگر دیکھو قیدی بھی تو اپنے آپ کو حاکم کے سپرد کر دیا کرتا ہے۔ لیکن وہ سپردگی دل سے نہیں ہوتی وہ زبردستی کی ہوتی ہے۔ مگر تمہارا مالک تمہارا آقا بہت مہربان ہے وہ ارحم الراحمین ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے اس نے تم کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ تم کو خلافت عطا فرمائی۔ اپنا نائب بنایا۔ پس تم جب اپنے آپ کو اس کے سپرد کرو تو یہ سپردگی دل سے ہو اس طرح کہ تم اپنی خوشی اور اپنی چاہ ختم کردو۔ مالک کی خوشی کو اپنی خوشی بناؤ۔ اور اس کی رضا میں راضی رہو۔ اس کے حکم کو اس طرح مانو کہ تمہارے دل میں کسی قسم کی کوئی خلش یا تنگی نہ ہو بلکہ شوق اور رغبت ہو۔

مثلاً اس مالک نے پنج وقتہ باجماعت نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ تم اس کی تعمیل اس طرح کرو کہ صبح کو سویرے اٹھنا۔ جماعت میں شرکت کرنا، تمہارے من کی چاہ اور دل کا شوق بن جائے۔

تمہارے مالک نے تمہیں زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ جو قومی ملی ضرورتیں پیش آئیں اس پر دل کھول کر خرچ کرو۔ غریبوں اور ضرورت مندوں

کی امداد کرو۔ پس اللہ کی راہ میں خرچ کرنا تمھارے دل کا شوق تمھارا ایک ولولہ اور جذبہ بن جائے۔ اس کا نام ہے "رضا"

پس تسلیم و رضا جو انسانیت کے کمالات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے مالک اور آقا کے اس طرح سپرد کر دو کہ اس کی مرضی تمھاری مرضی بن جائے۔ تم اسی میں خوش رہو جو تمھارے مالک اور پروردگار نے تمھارے لئے تجویز کر دیا ہے۔

صبر و شکر

عزیزان محترم۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رضائے مولیٰ کو پورا کرنے میں تمھیں مشکلات پیش آئیں خصوصاً ایسے وقت کہ جب حق اور باطل کا مقابلہ ہو۔ تم ان مشکلات کو ہنسی خوشی برداشت کرو اور اسی کی عادت ڈال لو۔ یعنی اپنے اندر برداشت کی عادت پیدا کرو۔ اسی عادتِ برداشت کا دوسرا نام "صبر" ہے جس کی بہت کچھ فضیلتیں قرآن پاک اور احادیث میں آئی ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے یقین دلایا ہے کہ اللہ تعالےٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتا ہے یعنی ہر وقت ان کا محافظ، حامی اور مددگار رہتا ہے۔

صبر کی مختلف صورتیں

ہم سمجھتے ہیں کہ "صبر" ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے جہاں کوئی جانی یا مالی مصیبت آئی ہو، کسی کا عزیز مر گیا ہو یا کسی کا مال تباہ ہو گیا ہو تو کہا کرتے ہیں "صبر" کرو یعنی واویلا اور ماتم نہ کرو۔ بیشک صبر کا ایک موقع یہ بھی ہے اس "صبر" پر بھی بہت کچھ ثواب کے وعدے قرآن شریف اور حدیثوں میں آئے ہیں۔ مگر

یہ بھی یاد رکھو کہ صبر اسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں اور ہر صورت کے الگ الگ نام ہیں۔

شجاعت میدان جہاد گرم ہے۔ دشمن حملے پر حملے کر رہا ہے، گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ اس وقت ضبط اور برداشت سے کام لو۔ دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو۔ اس کے دانت کھٹے کر دو۔ یہ بھی "صبر" ہے اس کو ہمارے یہاں بہادری اور عربی میں شجاعت کہتے ہیں۔

حلم تم کسی کا بھلا چاہتے ہو۔ مگر وہ نہیں سمجھتا۔ وہ تمھاری شان میں گستاخی کرتا ہے۔ بیہودہ بکواس کرتا ہے تمھیں جھنجل آتی ہے تم بے قابو ہونے لگتے ہو۔ چاہتے ہو کہ گالی کا جواب گالی سے دو۔ اور تم ایسا کر بھی سکتے ہو مگر تم مہذب اور شائستہ ہو۔ تمھاری زبان پر گالی کا آنا تمھاری شان کے خلاف ہے اور اگر تبلیغ کا موقع ہے تو اس گالی گلوچ سے تبلیغ کا مقصد فوت ہوتا ہے اور تم اس موقع پر ضبط و تحمل سے کام لیتے ہو۔ برائی کا جواب بھلائی سے، سختی کا جواب نرمی سے دیتے ہو۔ یہ بھی "صبر" ہے۔ اس کو ہمارے یہاں بُردباری اور عربی میں حلم کہتے ہیں۔

دیکھو سب سے زیادہ حلیم "اللہ" ہے۔ وہ اپنے پیدا کئے ہوئے محتاج بندوں کی نافرنیاں، سرکشیاں، گستاخیاں سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ اگر بگڑے تو ایک دم میں ساری دنیا فنا کر دے۔ مگر وہ سب کو نظر انداز کرتا ہے۔

قناعت تمھاری آمدنی تھوڑی ہے۔ بیوی بچوں کی فرمائشیں اس میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ رسم و رواج کی کوئی بات آتی ہے تب

بھی تم مجبور ہو جاتے ہو، اس آمدنی میں وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رشوت لے کر فرمائشیں پوری کی جاتی ہیں، یا خیانت یا چوری کی جاتی ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سودی قرض لیا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں حرام ہیں۔ تم ان حرام باتوں سے اپنا دامن بچاؤ۔ بیوی بچوں کو نرمی سے سمجھا دو۔ اپنے خرچ کو جائز اور حلال آمدنی سے آگے نہ بڑھنے دو۔ اس کے لئے بھی ضبط و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ تنگی ترشی برداشت کرنی ہوگی۔ یہ بھی "صبر" ہے۔ اس کو ہمارے یہاں کفایت شعاری کہتے ہیں۔ یہ کفایت شعاری ہنسی خوشی، رضائے مولےٰ کے لئے ہو۔ حرام تو حرام۔ مکروہ آمدنی سے بھی دامن بچا کر صرف جائز آمدنی ہی پر نظر رہے۔ اس کا نام "قناعت" ہے اور قناعت کرنے والے کو "قانع" کہتے ہیں اور اگر اس کفایت شعاری کا مقصد یہ ہو کہ زیادہ سے زیادہ بچا کر ضرورت مندوں کی امداد اور قومی کاموں میں زیادہ سے زیادہ خرچ کریں تو یہ "قناعت" سونے پر سہاگہ ہو جاتی ہے۔ اس کا درجہ خدا کے یہاں بہت ہی بلند ہے۔

عفت نفس کی خواہش نوجوانوں کو بُرے موقع پر بھی لے جاتی ہے یہاں ضبط و تحمل اور برداشت سے کام لو۔ شیطان نفس کا مقابلہ قوت سے کرو۔ یہ بھی صبر ہے۔ اس کو پاک دامنی اور عربی میں عفّت اور پاک دامن کو عفیف کہتے ہیں۔

تقویٰ اور زہد تمہیں خدا نے دولت دی ہے تم چاہتے ہو کہ کھیل تماشوں میں دولت اڑاؤ۔ ہر طرح کی عیش کرو۔ طرح طرح کی

چیزیں تمھارا دل لبھاتی ہیں، تم بار بار مچل جاتے ہو۔ ایسی حالت میں برداشت سے کام لینا اپنے نفس کو قابو میں رکھنا۔ شریعت نے جس کھیل تماشے، جس عیش و تفریح یا جس لباس و پوشاک، جس خورونوش اور جس سازوسامان کو ناجائز حرام یا مکروہ قرار دیا ہے اس سے بچنا۔ یہ بھی "صبر" ہے جس کے لئے پرہیزگاری تقویٰ طہارت اور "زہد" جیسے الفاظ بولے جاتے ہیں۔

شکر

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر ایک مصیبت اور بلا سے محفوظ رکھے۔ ہماری دعا یہی ہونی چاہئے۔ لیکن اگر خدانخواستہ کسی وقت کوئی مصیبت آن پڑے تو تم اس وقت بھی دیکھو گے کہ بہت سے وہ ہوں گے جو تم سے بھی زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوں گے اور جب تم ان پر نظر ڈالو گے تو تمھارا دل بھی گواہی دے گا کہ اللہ تعالےٰ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ خدا نے اس مصیبت سے مجھے محفوظ رکھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ اگر کسی وقت ایک انعام سے محرومی ہو جاتی ہے تو سیکڑوں طرح کے دوسرے انعامات پھر بھی گھیرے رکھتے ہیں، بہت سے انعامات ایسے ہیں جن کا ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ہمارا سانس یا وہ ہوا جس میں سانس لیا جائے کتنا بڑا انعام ہے۔ مگر ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ پس ہمارا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہر حال میں اور ہر موقع پر ادا کرتے رہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اُن پر نظر رکھو جو تم سے کمتر ہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر زیادہ کر سکو گے۔

ایک بزرگ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا تمام بدن گل گیا تھا۔ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار کروٹ لینا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ صرف اس کا سانس چل رہا تھا اور اس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ اس بزرگ نے بیمار کے ہونٹوں سے کان لگائے تو زبان سے الحمد للہ الحمد للہ کی تسبیح جاری تھی۔ بزرگ کو تعجب ہوا۔ اور اس سے پوچھا۔ بندۂ خدا۔ اب کون سی نعمت ہے جس پر تم حمد کر رہے ہو۔

مریض: یہ احسان کتنا بڑا ہے کہ مجھے صبر بخشا اور شکر کی توفیق عطا فرمائی۔ میں اللہ کا نام لے رہا ہوں۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے اپنا نام لینے کی توفیق بخشی۔

سخاوت اور ایثار

سخاوت کا نام سنا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ مال بخش دینا سخاوت ہے۔ مگر اصل سخاوت یہ ہے کہ اپنی ضرورت پیچھے ڈال کر دوسروں کی ضرورت پوری کرو۔ اس کو عربی میں ایثار کہتے ہیں۔ جب صحابہ کرام مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کے سپرد کر دیا تھا کہ ان کو اپنا ساجھی مان کر اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیں۔

اس وقت انصاری حضرات کا ایثار یہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کو معمولی کھانا کھلا کر سلا دیتے اور مہاجر ساجھیوں کے لئے اپنے مقدور سے بڑھ کر خدمت کرتے پھر یہ ایک دو دن کی بات نہ تھی۔ بلکہ اس وقت تو زندگی بھر کا ساجھی بنایا گیا تھا۔ پھر یہ اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم تھا کہ تین[1] چار سال بعد ہی خدا نے ایسی

---

[1] کچھ مہاجر حضرات تو وہ تھے جنھوں نے پہلے ہی دن سے اپنا کام شروع کر دیا۔ باقی عام طور پر ہجری چوتھے سال جب بنی نضیر کی ضبط شدہ جائدادیں تقسیم ہوئیں۔ تب مہاجر حضرات خود کفیل ہو سکے

صورتیں پیدا کر دیں کہ تمام مہاجر حضرات اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور امداد لینے کے بجائے دوسروں کی امداد کرنے لگے۔

استغنا جب تم خلیفہ ہو تو اسی سے مانگو جس نے خلیفہ بنایا۔ کسی کے سامنے ہاتھ مت پھیلاؤ۔ سوال ذلّت ہے۔ خلیفہ کو ذلت سے بچنا ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے عہد لیا تھا کہ وہ کسی سے سوال نہ کریں گے۔ پھر ان بزرگوں کی حالت یہ تھی کہ اگر وہ اونٹ پر سوار ہوتے اور کوڑا گر جاتا تو اونٹ کو بٹھا کر کوڑا خود اٹھاتے کسی سے کوڑا اٹھا کر دے دینے کو بھی نہ کہتے تھے کہ یہ بھی ایک طرح کا سوال ہو جائے گا۔

تم اپنے آپ کی عزّت کرو اور ایسے کاموں سے بچو جس میں ذلت ہو۔ کسی کی عطا اور بخشش پر نظر ہرگز نہ رکھو۔ لومڑی دوسرے شکاری جانوروں کا پس خوردہ کھاتی ہے اسی لئے وہ ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ شیر اپنا شکار دوسروں کو بخشتا ہے اس لئے وہ بہادر اور غیور مانا جاتا ہے۔ البتہ قومی اور جماعتی کاموں کے لئے جن میں خود آپ کی اپنی غرض کچھ نہ ہو، سوال کر سکتے ہو۔ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کاموں کے لئے چندہ کیا ہے۔

اس سوال میں بھی ذلّت ہوتی ہے۔ مگر یہ ذلّت اللہ کے لئے ہوتی ہے یہ ایک قسم کی ریاضت ہے بشرطیکہ نیت میں اخلاص ہو۔

خشوع اور خضوع ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھو۔ ہمارا مالک رب العالمین جس نے انسان کو خلافت کا شرف بخشا بہت بے نیاز ہے۔ ادھر ہماری حالت یہ ہے کہ ہمیں خلافت کا بلند مرتبہ تو عطا فرما دیا مگر

ہماری حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم سراسر محتاج ہی محتاج ہیں

خلیفہ کا جیسا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی بہت ہوتی ہے ہماری ذمہ داری بھی بہت ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم رات دن کا ایک ایک لمحہ اللہ کے کاموں میں اور یاد خدا میں خرچ کرتے رہیں تب بھی ہماری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ خدا کی دی ہوئی طاقت سے کرتے ہیں اور وہ کرنا بھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے ہر کام میں خوبیاں کم اور خرابیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

پس جتنے بھی تم اچھے کام کرو۔ گھمنڈ ہرگز نہ کرو بلکہ اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم پر نگاہ رکھو۔ وہ اپنے فضل سے قبول فرمائے اور ساتھ ساتھ دل میں یہ خوف بھی رکھو کہ اس کی ذات بے نیاز ہے۔ چاہے تو کسی بھی خرابی پر پکڑ کر سکتی ہے اور ہمارے کئے دھرے کو ٹھکرا سکتی ہے۔ پس ہر موقع پر ڈرتے رہو اور اپنی کمزوری عاجزی اور لاچاری کو سامنے رکھ کر خدا کے سامنے گڑگڑاتے رہو اسی کا نام خشوع اور خضوع ہے۔

جب تمہاری نگاہ اپنی کمزوریوں پر ہوگی تو کسی دوسرے کام کو حقیر نہیں سمجھو گے نہ کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھو گے کیونکہ تمہیں خود بھی یہ احساس رہے گا کہ ہم حقیر ہیں۔ کمزور ہیں گنہگار ہیں۔ دن رات میں خدا جانے کتنے گناہ ہو جاتے ہیں جن کا ہمیں خیال تک نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا اَسْرَرْتُ وَاَعْلَنْتُ

وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنّی

اے اللہ میرے وہ تمام گناہ بخش دے جن کو میں نے چھپا کر کیا یا
علانیہ کیا اور وہ تمام گناہ بخش دے جن کا مجھ سے زیادہ تجھے علم ہے

استاد محترم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ دعا یاد کرو اور ہمیشہ
پڑھتے رہا کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یہ بھی ہوتی تھی

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّ فِیْ رَضَاكَ ضَعْفِیْ

اے اللہ بیشک میں کمزور ہوں۔ پس طاقت سے بدل دے اپنی خوشنودی حاصل کرنے میں میری کمزوری کو

وَخُذْ اِلَی الْخَیْرِ بِنَا صِیَتِیْ

اور پکڑ جانب خیر کے میری پیشانی (مجھے اپنی قدرت سے خیر اور بھلائی کی طرف جھکا دے)

وَاجْعَلِ الْاِسْلَامَ مُنْتَھَاءَ رِضَائِیْ ؀

اور بنا دے اسلام کو انتہا درجہ کی میری خوشی
(اسلامی احکام کی تعمیل اور خدمت اسلام میری انتہا درجہ کی خوشی ہو)

بچّوں کی

بین الاقوامی کانفرنس

انسانی مساوات، بھائی چارہ، پیداوار، ملکیت اور
سود پر سیر حاصل بحث

اسلامی نقطۂ نظر

ہونہار طلبہ، ذہین اور شوقین بچے خود مطالعہ کریں، سمجھیں اور سمجھائیں
ہفتہ واری جلسوں میں یہ مضامین بیان کریں یا تقریر کی طرح
پڑھ کر سنائیں۔ یہ مضامین بچوں کی طرح بڑوں کے لئے بھی مفید ہونگے

شائع کنندہ

۱۔ الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی ۲۔ کتابستان گلی قاسم جان، دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بین الاقوامی کانفرنس

ہمارے دار العلوم (یونیورسٹی) میں ساری دنیا کے طالب علم پڑھتے ہیں دنیا کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں ہے جہاں کے دو چار طالب علم اس دار العلوم میں داخل نہ ہوں۔

ہر ملک کے طلبہ نے اپنی اپنی انجمنیں الگ الگ بنا رکھی ہیں۔ ہفتہ وار ان کے جلسے ہوتے ہیں، جن میں تقریریں ہوتی ہیں۔ خاص خاص مسائل پر مقالے پڑھے جاتے ہیں جن کو استادوں کی رہنمائی میں خود طلبہ ہی مرتب کرتے ہیں۔ اس سال چند مسئلوں پر بہت بحثیں رہیں۔ مقالے بھی لکھے گئے۔ مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کے طلبہ کی رائے ان مسئلوں میں مختلف رہی۔ ان مسئلوں سے طلبہ کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ یونیورسٹی کے اکثر حلقوں میں انھیں کا چرچا رہنے لگا۔ ہر ایک دوسرے کی رائے معلوم کرتا اور اس پر بحث کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ طلبہ میں خیال پیدا ہوا کہ پوری یونیورسٹی کے طلبہ کی ایک ملی جلی کانفرنس کی جائے۔ اس کانفرنس میں ان مسئلوں پر بحث ہو تاکہ یونیورسٹی کے تمام طلبہ

ایک دوسرے کی رائے معلوم کرکے ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ مگر پورے
دارالعلوم کے تقریباً دس ہزار طلبہ بحث میں حصہ نہیں لے سکتے تھے تو یہ طے کیا گیا کہ
ہر ایک ملک کا ایک ایک نمائندہ لیا جائے۔ مگر ان کی تعداد بھی سو کے قریب
ہو جاتی تھی تو ضرورت سمجھی گئی کہ اس تعداد میں بھی کسی طرح کمی کی جائے۔
ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہر مسئلہ میں عام طور پر تین رائے تھیں تو طے کیا گیا کہ
جس مسئلہ میں جن ملکوں کی رائے متفق ہو اُن کا ایک بلاک فرض کرلیا جائے اور
ہر ایک بلاک کا ایک ایک نمائندہ اس بلاک کا ترجمان قرار دیا جائے۔ اس طرح پوری
یونیورسٹی کے طلبہ یا یہ کہو پوری دنیا کے طلبہ تین بلاکوں میں تقسیم ہو گئے۔
ہر ایک بلاک میں شریک ہونے والے ملکوں اور قوموں کی فہرستیں تیار
ہو گئیں اور یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہال میں اس کانفرنس کا انتظام کیا گیا۔
جو صحیح معنوں میں بین الاقوامی کانفرنس ہو گئی۔
بلاک میں شامل ہونے والے ملکوں کی پوری فہرستیں نقل کرنا غیر ضروری ہے
البتہ یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ بلاک ۳ میں زیادہ تر بلکہ تمام تر وہی ممالک
شامل ہوئے جو مسلم ممالک کہلاتے ہیں۔
اب سنئے وہ مسائل جو پوری یونیورسٹی کی فضا پر چھا گئے تھے۔ یہ تھے

۱۔ انسانی مساوات۔

۲۔ مرد اور عورت کا رشتہ اور ہر ایک کے فرائض۔ انسانی مساوات کے تقاضے۔

۳۔ دولت کس کی مِلک ہے۔

۴۔ تجارت کا بنیادی مقصد۔ ۵۔ سود

انسانی مساوات اور بھائی چارہ

بلاک ۱۷ کا نمائندہ ایک گورے رنگ اور لانبے قد کا طالب علم تھا۔ کانفرنس کی ابتدائی کارروائی کے بعد سب سے پہلے اسی کا نمبر تھا۔ اس نے بڑی قوت سے دعویٰ کیا کہ مساوات اور برابری کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے سب فریب ہے۔ "برابری" کا نعرہ لگانے والے خود سمجھتے ہیں کہ یہ گری ہوئی پست اور نیچ برادریوں کو خوش کرنے کی بات ہے تاکہ الیکشن جیسے موقعوں پر ان کا ساتھ دیتے رہیں۔

انسانوں کے اندر فرق ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب۔ کوئی ذہین اور ہوشیار ہے۔ کوئی کند ذہن، غبی اور بے وقوف۔ کوئی کالا ہے کوئی گورا کوئی خوب صورت کوئی بد صورت۔

پھر انسانی برادریوں میں بھی اسی طرح فرق ہے۔ کوئی برادری بہادر ہوتی ہے کوئی بزدل کسی برادری کو تجارت سے شوق ہوتا ہے۔ وہ فطرتاً تجارت سے مناسبت رکھتی ہے۔ کوئی برادری دستکار ہے۔ کوئی پیشہ ور، کوئی کاشتکار۔ یورپ کے باشندے گورے رنگ کے جس طرح شکل و صورت میں خوبصورت ہوتے ہیں ایسے ہی وہ سلیقہ مند اور مہذب بھی ہوتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ایشیا اور افریقہ کے باشندے تہذیب اور شائستگی سے محروم ہوتے ہیں، نہ ان میں ذہانت ہوتی ہے اور نہ ترقی کی امنگ، زیادہ تر جاہل ہوتے ہیں۔ حبشیوں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔

پرانا عقیدہ یہ تھا کہ پیدائشی طور پر انسانوں کے چار درجے ہیں
ایک سب سے زیادہ شریف۔ صاحب علم و فضل۔ یہ گویا خدا کے
سر سے پیدا ہوئے۔

دوسرے سب سے زیادہ بہادر یہ گویا خدا کے دست و بازو سے پیدا ہوئے۔ تیسرے وہ جو بہادر تو اتنے نہیں ہوتے البتہ کاروبار سے ان کو فطرتاً تعلق ہوتا ہے، چوتھے وہ جن میں یہ باتیں نہیں ہوتیں۔ نہ اُن میں تہذیب و سلیقہ ہوتا ہے اور نہ انھیں پاکی ناپاکی کی تمیز ہوتی ہے۔ یہ خود بھی گندے ہوتے ہیں اور اپنے پاس والوں کو بھی گندہ کر دیتے ہیں اس لئے ان سے علیحدہ رہنا اور بچنا ضروری ہے۔ اگر یہ کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ ان کو ہدایتیں کی جاتی ہیں اور یہ سر جھکا کر خدمت کرتے رہیں۔

اس نمائندے نے کہا۔ کچھ برادریوں کا عقیدہ تھا کہ وہ "چاند" کی اولاد ہیں۔ کچھ کا عقیدہ تھا کہ ان کا نسب سورج سے ملتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنی تہذیب، شائستگی اور بہادری میں اتنے اونچے ہوتے تھے کہ دوسرے لوگ ان کے سامنے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کوڑا کرکٹ ہوں اور یہ آفتاب و ماہتاب۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو چاند اور سورج کی اولاد سمجھتے تھے۔

بلاک ۲ کا نمائندہ نہایت چست۔ گول چہرہ۔ رنگ سرخ عنابی۔ دوہرا بدن۔ درمیانہ قد۔ ننگے سر۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے جب اس کا نمبر آیا تو جوش میں بھرا ہوا۔ بڑی پھرتی سے کھڑا ہوا۔ اور جناب صدر اور حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

مجھے آپ اجازت دیں کہ میں اس تاریخی حقیقت کا اظہار کروں کہ ہمیشہ دنیا دو حصّوں میں تقسیم رہی ہے۔ زبردست اور زیردست۔ جو لوگ دولت، حکومت یا جتھہ بندی کی طاقت سے بالا دست رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی بالا دستی اور اپنی بڑائی کو قائم رکھنے کے لئے کہیں رنگ کا فرق پیدا کر دیا ہے کہ سفید فام حاکم اور سیاہ فام محکوم اور غلام۔ کہیں نسلی امتیاز پیدا کر دیا ہے کہ فلاں برادری خدا کے چہرے سے پیدا ہوئی۔ فلاں خدا کے سینے اور شانوں سے۔ کہیں اپنی نسل کا رشتہ چاند اور سورج سے جوڑا کہ جو زیردست اور کمزور ہیں وہ یہ سمجھیں کہ ان کی بڑائی کا مقابلہ گویا قدرت کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس طرح کے لوگوں نے ان باتوں کو مذہب کا رنگ بھی دے دیا کہ جس کے پاس راج پاٹ ہے وہ خدا کا اوتار ہے۔ جس کے پاس دولت ہے وہ خدا کا چہیتا ہے۔ اب دنیا ان ہتکنڈوں کو سمجھ گئی ہے۔ اب وہ بڑا ہے جو دنیا کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں سب سے آگے رہے۔

بلاک ۳ کا نمائندہ شاندار یا فیشن ایبل تو نہیں تھا۔ ایک سیدھا سادہ طالب علم تھا۔ مگر اس کے چہرے بشرے اور اس کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو سوچنے اور سمجھنے کی عادت ہے وہ جذبات میں بہنے والا نہیں، بلکہ بات کی تہ کو پہنچ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش

کرتا ہے۔ وہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کھڑا ہوا۔ اس نے نہایت ادب سے جناب صدر کو مخاطب کیا۔ پھر بہت سلجھے ہوئے انداز میں تقریر شروع کی۔

جناب والا فاضل مقررین کی تقریریں میں غور سے سنتا رہا۔ مجھے معاف فرمائیں۔ بلاک ۲ کے فاضل ترجمان، ان کی تقریر اگرچہ سراسر جذبات کی بوچھاڑ تھی۔ مگر اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکے کہ انسانوں میں فرق ضرور ہے۔ پھر آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ فرق خود انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے فطرت نے کوئی فرق قائم نہیں کیا اور بلاک ۱ کے نمائندہ محترم کا خیال یہ ہے کہ یہ فرق قدرتی اور فطری ہے۔ میں شکر گزار ہوں ان دونوں صاحبان کا کہ انھوں نے میری تقریر کے لئے موضوع معین کر دیا۔ اب میں اس پر بحث کروں گا کہ یہ فرق فطری ہے یا مصنوعی۔

جناب صدر اور حاضرین محترم۔ بے شک کچھ فرق ایسے ہیں جو فطری معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً رنگ کا فرق یا شکل و صورت کا وہ فرق جو جغرافیائی حالات کی بنا پر ہوتا ہے کہ گرم ملک کے باشندوں کا مزاج سرد ملک کے باشندوں کے مزاج سے الگ ہوتا ہے۔ لیکن یہ فرق ایسے ہیں کہ ان سے انسانیت میں فرق نہیں آتا۔ وہ خصوصیات جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں وہ گوروں میں بھی پائی جاتی ہیں اور کالوں میں بھی۔ جس طرح گرم ملکوں کے باشندے عالم۔ فاضل۔ بااخلاق۔ شریف یا غیر شریف۔ رذیل۔ جاہل، بدخلق اور شریر ہوتے ہیں ایسے ہی سرد ملکوں کے باشندے بھی اچھے برے بہت اچھے اور بہت برے بھی ہوتے ہیں۔ کمی بیشی کا فرق ہو سکتا ہے مگر وہ تقاضاً

فطرت کی بنا پر نہیں بلکہ حالات کی بنا پر ہو جاتا ہے کہ کہیں تعلیم و تربیت کا نظام اچھا ہے کہیں اچھا نہیں ہے اور کہیں بالکل نہیں ہے۔

ان کے علاوہ وہ فرق جس کا تعلق انسان کے حالات سے ہے مثلاً امیر یا غریب ہونا، بیمار یا تندرست ہونا یا انسانی خصوصیات سے ہے مثلاً عالم یا جاہل ہونا۔ دانا یا نادان ہونا۔ بہادر یا بزدل ہونا۔ ان فرقوں کے متعلق بلاک ۲۷ کے نمائندہ صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ انسان نے خود قائم کئے ہیں اور بسا اوقات اپنے غلبہ اور اپنے تسلّط کو قائم رکھنے کے لئے یہ فرق قائم کئے ہیں۔ مثلاً ایک ایسی برادری نے جو حاکم تھی علم کو خاص اپنے خاندانوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ محکوموں پر علم کے دروازے بند کر دئے تاکہ وہ ترقی کر کے ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ بلاک ۱ کے نمائندے نے یہ بتایا کہ یہ فرق قدرتی ہے کیونکہ ان برادریوں کی پیدائش میں کچھ امتیاز تھے۔ مثلاً کسی کا سلسلہ چاند سے جڑتا تھا اور کوئی سورج سے میل کھاتا تھا یا کوئی نسل خدا کے ایک حصّہ سے وجود میں آتی تھی اور دوسری نسل دوسرے حصّہ سے۔ بلاک ۱ کے ترجمان محترم کی بات تسلیم کر لیتا اگر اس قبیلہ اور خاندان کا ہر فرد عالم، پاکباز، یا عقلمند اور بہادر ہوا کرتا جس کو وہ سورج یا چاند کی اولاد قرار دیتے ہیں لیکن جب ہم کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ ان میں بھی جاہل، نااہل اور نالائق ہوتے ہیں اور جو عالم و فاضل اور قابل ہوتے ہیں وہ بھی ماں کے پیٹ سے عالم و فاضل نہیں ہوتے بلکہ ان کو اسی طرح تعلیم دی جاتی ہے کہ ایسی تعلیم دوسری برادریوں کے بچوں کو دی جاتی تو وہ بھی عالم، فاضل اور صاحب کمال

بن سکتے تھے۔ تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ فرق قدرتی نہیں ہے۔ قدرت نے انسانی صلاحیتوں اور کمالات کو کسی خاص نسل۔ کسی خاص قوم اور برادری میں مخصوص نہیں کیا ہے۔ فرق جو کچھ بھی ہے "کسب" اور عمل کی بنیاد پر ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بلاک ۱۲ کے نمائندہ محترم نے اس فرق کو "چیرہ دستوں" کے سر تھوپا ہے اس سے طبقاتی نفرت تو پیدا ہو سکتی ہے کہ جو پچھڑے ہوئے اور پس ماندہ ہیں وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھ کر ترقی یافتہ لوگوں سے نفرت کرنے لگیں۔ خود ان پس ماندہ لوگوں میں جذبہ عمل اور بیداری نہیں پیدا ہو سکتی، اگر ہوتی ہے تو اس طرح کہ ایک طبقہ سے نفرت اور انتقام لینے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، جو انسانی بھائی چارہ کے لئے ایٹم بم ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پس ماندہ اور پچھڑا ہوا طبقہ اگر ترقی کرتا ہے تو ترقی کے ساتھ اپنا ایک جائز بلکہ لازمی حق سمجھتا ہے کہ جو اب تک ترقی یافتہ تھے ان کا قلع قمع کرے۔

جناب صدر اور محترم حاضرین۔ ہم مسلمان مجبور ہیں کہ ہر ایک انسان کو دوسرے کا بھائی اور انسانی حقوق میں ہر ایک کو دوسرے کے مساوی سمجھیں۔

حاضرین کرام۔ یہ تحقیق سائنس کے راستے سے بہت مشکل ہے کہ انسان کس طرح وجود میں آیا۔ وہ کوئی کیڑا تھا جس نے ترقی کرتے کرتے انسانی شکل و صورت اختیار کی۔ یا برساتی کیڑوں کی طرح یوں ہی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو گیا۔ اس تحقیق سے تہذیب و اخلاق اور انسانی شرافت

عظمت کے بنیادی مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور یہ تحقیق ناممکن بھی ہے، کیونکہ انسان اور دوسری مخلوقات میں شکل و صورت، عقل و فہم اور ذہنی صلاحیتوں کا اتنا بڑا فرق ہے کہ صرف قادر مطلق کی قدرت کاملہ تو اس کو اٹھا سکتی ہے، سائنس کوئی ایسی کڑی نہیں تلاش کر سکتی جو انسان کو کسی بھی مخلوق سے جوڑ دے۔

حاضرین محترم۔ ہمیں اس کا حکم نہیں ہے کہ ہم سائنس اور فلسفہ کی ان خیالی باتوں میں وقت اور عمر ضائع کریں جن سے نوع انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہمیں اس کا حکم ہے کہ ہم تمام انسانوں کو وہ کالے ہوں یا گورے۔ خوبصورت ہوں یا بدصورت، عالم ہوں یا جاہل، نیک ہوں یا بد۔ سب کو ایک ماں باپ کی اولاد مانیں اور یہ تسلیم کریں کہ یہ جو کچھ فرق ہے وہ کسب اور عمل کی بنا پر ہے۔

قرآن حکیم کی ہر ایک بات پر ایمان لانا مسلمان پر فرض ہے۔ قرآن حکیم نے اعلان کیا ہے۔

"اے انسانو اللہ نے تم کو پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور تمہارے قبیلے اور برادریاں اس لئے مقرر کر دی ہیں تاکہ جان پہچان میں آسانی ہو۔ جہاں تک بڑائی اور شرافت و عظمت کا تعلق ہے اس کا مدار عمل پر ہے۔

کچھ جغرافیائی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنا پر انسان کو اپنی فضیلت کا خیال ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی مقدس مقام یا کسی تیرتھ کے رہنے والے اپنے آپ کو افضل اور اعلیٰ سمجھنے لگیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفائی

سے اعلان کر دیا لا فضل لعربی علی عجمی یعنی زبان کی بنا پر یا اس بنا پر کہ اللہ کا گھر "کعبہ" سرزمین عرب میں ہے۔ عرب کے باشندوں کو غیر عربوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

اسی طرح ارشاد ہوا کہ سرخ رنگ والوں کو زرد رنگ والوں پر، سفید فاموں کو سیاہ فاموں پر محض رنگ کی بنیاد پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ جہاں تک نسلی امتیاز کا تعلق ہے تو قرآن کریم میں چند جگہ اس واقعہ کا ذکر آیا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر جب شیطان سے وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا میری پیدائش آگ سے ہوئی ہے آدم کی مٹی سے۔ یہ واقعہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ نسلی امتیاز پر گھمنڈ کرنا شیطانی فعل ہے۔

حسب نسب اور خاندان کی وہ وجاہت اور عظمت جو تاریخی کارناموں کی بنا پر سوسائٹی میں تسلیم شدہ ہوتی ہے۔ اگر اس کا اثر یہ ہو کہ شریفانہ ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شریف، نیک، با اخلاق با مروت ہو گئے ہیں تو بہت بہتر ہے۔ یہ حسب نسب آپ کیلئے سونے پر سہاگہ کا کام دے سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ نے شریف ماحول سے فائدہ اٹھا کر نیک با اخلاق اور با مروت بننے کی کوشش نہیں کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔

(جس کو اس کے عمل نے پیچھے ڈال دیا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔)

اسلام نے جو بھائی چارہ مردوں میں قائم کیا ہے۔ عورتوں کو بھی اس سے محروم نہیں رکھا۔ چنانچہ بتا دیا کہ عورت مرد ہی کا ایک جزو ہے

نہیں ایک اصل[۱] جس سے مرد پیدا ہوا ہے۔ اسی سے عورت پیدا ہوئی ہے[۲]
ایک مشہور روایت ہے کہ عورت مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے
ہم اپنی اولاد کو جگر کا ٹکڑا کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنے جگر کی طرح وہ عزیز ہوتی
ہے اور جو کچھ اپنے جگر کے لئے کر سکتے ہیں اس سے زیادہ اولاد کے لئے کرتے ہیں
پس ایک مرد کا تعلق اپنی بیوی سے اسی طرح کا ہونا چاہئے[۳]

---

[۱] هو الذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منها زوجها الاٰیۃ (انعام)
وایضاً سورۂ نسار رکوع اول

[۲] بعض پہاڑی علاقوں میں کچھ قبیلے اب بھی ایسے ہیں جن میں عورت کو اصل مانا جاتا
ہے اور مویشی کی طرح اولاد ماں کی مانی جاتی ہے۔ لیکن تمام متمدن و مہذب دنیا مرد کو
اصل قرار دیتی ہے اور اولاد کا تعلق مرد سے مانتی ہے۔

[۳] یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ بیشک اس کمزوری
سے فائدہ اٹھا کر عورت کو یہاں تک ذلیل کیا گیا کہ اس کو مرد کی ایک پونجی مان لیا گیا جس کی
پوری زندگی مرد کے لئے ہے یہاں تک کہ اگر مرد مر جاتا ہے تو عورت کی زندگی بے کار ہے
اس کو بھی مر جانا چاہئے۔ پھر اس کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی گئی۔ عربوں میں لڑکیوں کو
زندہ دفن کر دینا ایک مردانگی مانا جاتا تھا۔ ہندوستان میں ستی کی رسم عام تھی۔ اس کے برخلاف
قرآن حکیم نے یہ اعلان کیا۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ عورتوں کے بھی اسی
طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں کہ ان کے ساتھ
اچھا سلوک کریں۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے (سورہ بقرہ ع ۲۸) مگر اسلام نے
اس کمزوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو عورت کی فطرت ہے جس کی بنا پر اس کو صنف نازک کہا

(باقی حاشیہ صفحہ ۶۱ پر)

بلاک ۳ کے ترجمان کی تقریر یہیں تک پہنچی تھی کہ پنج ٹائم ہوگیا۔
صدر کانفرنس نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نشست کے
ملتوی ہونے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ بلاک ۳ کے نمائندہ
محترم کو اگلے اجلاس میں یہ بتانا ہوگا کہ مساوات کو عملی جامہ پہنانے
کی کیا صورتیں ہونی چاہئیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جاتا ہے اور جس کی بنا پر مرد کو عورت کا ذمہ دار بننا پڑتا ہے
چنانچہ حقوق و فرائض کی ذمہ داری میں مساوات کا اعلان کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا گیا ہے
الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض و بما انفقوا من اموالھم
الآیۃ (سورۂ نساء ع ۵) مرد عورتوں کی زندگی کے بندوبست کرنے والے ہیں۔ اس لئے
اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر خاص خاص باتوں میں فضیلت دی ہے نیز اس
لئے کہ مرد اپنا مال (جو ان کی محنت سے حاصل ہوتا ہے عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔
پس جو عورتیں نیک ہوتی ہیں ان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں
اور اللہ کی حفاظت سے (جو انھیں حاصل ہوجاتی ہے) پوشیدگی اور غیبت میں
(پیٹھ پیچھے بھی) شوہروں کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کرتی ہیں

کانفرنس کی دوسری نشست

مساوات کے تقاضے اور عملی صورتیں

بلاک ۳ کے ترجمان نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں میں نے اس کی تائید کی تھی کہ ہر ایک انسان دوسرے کا بھائی اور انسانی حقوق میں سب انسان برابر ہیں۔ جناب صدر کی ہدایت ہے کہ میں اس کی مزید تشریح کروں اور یہ بتاؤں کہ جب ہم اس نظریہ کو تسلیم کریں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا اور جو حکومت اس نظریہ کو اپنائے اسے کیا کرنا ہوگا۔ میں پہلے اپنے فرائض عرض کروں گا پھر حکومت کے فرائض شمار کراؤں گا۔

انسانی بھائی چارہ اور ہمارے فرائض

(۱) دوسروں کے لئے وہ پسند کریں جو خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں[1]۔ یعنی جو آسائش فراخی اور فارغ البالی ہم اپنے لئے پسند کرتے ہیں کوشش کریں کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہو۔ جس طرح ہم اپنی اولاد کو ترقی پذیر تعلیم یافتہ بنانا چاہتے ہیں کوشش کریں کہ دوسروں کی اولاد بھی اسی طرح تعلیم یافتہ، ترقی پذیر، مہذب اور شائستہ ہو۔ اس سلسلہ میں جو کچھ ہم خود کر سکتے ہوں وہ خود کریں اور جہاں ہماری کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو وہاں ہم مدد پہنچائیں۔

---

[1] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یحب لاخیک ما تحب لنفسک

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ چشم پوشی، معافی اور درگذر سے کام لیا جائے تو دوسروں کے ساتھ بھی عفو و درگذر سے کام لیں۔ انکی کمزوریوں کی پردہ پوشی کریں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر رحم کیا جائے تو ہم بھی دوسروں پر رحم کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

زمین والوں پر رحم کرو۔ تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری عزت ہو۔ ہمارے باپ دادوں کا نام ادب اور احترام سے لیا جائے۔ ہمارے بزرگوں کی تعظیم کی جائے تو ہم بھی دوسروں کی عزت کریں، ان کے باپ دادوں کی توہین نہ کریں۔ ان کے بزرگوں کا نام ادب و احترام سے لیں۔

اگر ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ وہ احترام کے قابل نہیں ہیں تب بھی ہم اس کا لحاظ ضرور رکھیں کہ ان کے متعلق بے ادبی اور توہین کی کوئی بات زبان پر نہ لائیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری برائی ہماری پیٹھ پیچھے نہ ہو تو ہم بھی دوسروں کی برائی ان کے پیچھے نہ کریں۔

بُرے ناموں سے اگر ہمیں نفرت ہے تو ہم دوسروں کے لئے چڑانے اور مذاق اڑانے کے نام تجویز نہ کریں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی آتی ہے کہ جو مذہب ہم اپنے لئے پسند کرتے ہیں اور اس کو اپنی دینی اور دنیاوی بھلائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم کوشش کریں کہ دوسرے بھی اس کو اپنائیں۔ مگر ہماری یہ کوشش جس طرح خیرخواہی کے سچے جذبے کے ساتھ ہو اسی طرح اس کا

انداز بھی دانشمندانہ اور نصیحت آمیز ہو۔ جس سے دوسرے پر یہ اثر پڑے کہ واقعی آپ اس کے خیرخواہ ہیں اور خیر خواہی اور محبت کے جذبہ ہی سے آپ اس کو دین کی دعوت دے رہے ہیں۔ نفرت یا حقارت یا اپنے آپ کو بہتر اور اچھا ظاہر کرنے کے لیئے آپ اس کو اپنے مذہب کی دعوت نہیں دے رہے۔

(۲) نہ کسی انسان کو حقیر، رذیل اور ذلیل سمجھیں اور نہ کسی برادری اور قوم کو رذیل و ذلیل سمجھیں[۱]۔ دن رات کی تبدیلی کی طرح انسانوں اور قوموں کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے آج جن کو ذلیل سمجھا جاتا ہے کل کو وہی عزت والے ہو جائیں۔

(۳) کسی بھی انسان کو ناپاک نہ سمجھیں۔ وہ کالا ہو یا گورا۔ اس کا کوئی مذہب ہو۔ کوئی بھی پیشہ کرتا ہو۔ اس سے چھوت چھات نہ کریں۔

(۴) جو عزت اور احترام کے قابل ہیں ان کا احترام ضرور کریں مگر کسی بھی انسان کو خدائی کے درجہ پر نہ پہنچائیں کسی کو خدا کا بیٹا، اوتار یا خدا کا مظہر نہ سمجھیں۔ کیونکہ بندہ بندہ ہے۔ خدا۔ خدا۔ بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو خدا نہیں بن سکتا۔

(۵) کسی بھی انسان کو خواہ وہ بادشاہ ہو یا شہنشاہ یا کوئی مذہبی پیشوا یہ حیثیت نہ دیں کہ حکم خدا کے مقابلہ میں اس کی اطاعت درست مانی جائے۔ یہ بات کہ خدا کی نافرمانی ہو اور مخلوق کی فرماں برداری ہو۔ یہ عقیدہ توحید کے بھی مخالف ہے اور مساوات انسانی[۲] بھی اس اونچ نیچ کو برداشت نہیں کرسکتی۔

---

[۱] لا یسخر قوم من قوم الایۃ سورہ حجرات [۲] لا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ (سورۂ آل عمران ع ۷)

مساواتِ انسانی اور فرائض حکومت

بلاک ۳ کے ترجمان نے تقریر کرتے ہوئے کہا

یہ پانچ نمبر وہ تھے جو ہم سے یعنی ہر اُس انسان سے متعلق ہیں جو انسانی بھائی چارہ کا حامی ہے۔ اب میں وہ باتیں عرض کروں گا جن کا پورا کرنا حکومت کا فرض ہوگا۔

مگر جب "حکومت" کا نام آیا ہے تو یہ بات واضح کر دینی ہے کہ حکومت سے مراد "بادشاہت" نہیں ہے۔ بادشاہت میں کسی انسان یا کسی خاندان کو ملک کا مالک مان لیا جاتا ہے۔ ملک کے باشندے اس کی رعایا مانے جاتے ہیں اس طرح کی اونچ نیچ مساوات کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ ملوکیت اور بادشاہت کے ساتھ انسانی بھائی چارہ کا جوڑ نہیں جڑتا۔

میری مراد حکومت سے "صرف ایک ایسا بندھن ہے جس کے ذریعے ملک اور باشندگان ملک کی مشترکہ ضرورتیں پوری ہو سکیں"

حکومت کا یہی تصور انسانی بھائی چارہ کے ساتھ میل کھاتا ہے۔ کیونکہ انسان جب مل جل کر رہنے کے عادی ہیں[1] اور ان کی فطرت میں قدرت نے ترقی بھی رکھی ہے تو ان کی ضرورتیں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ ہر شخص اپنی ضرورت کی ہر

---

[1] یعنی مدنیت اور شہریت

چیز خود[1] سے فراہم نہیں کر سکتا۔ لامحالہ اس کو امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسا بندھن وجود میں آجائے جس کے سایہ میں یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور جو رکاوٹیں آئیں وہ اٹھائی جاتی رہیں۔ یہ بندھن جس کو وہ انسان قائم کریں گے جو مساوات اور برابری کے قائل ہیں جن کو آجکل کی اصطلاح میں جمہور کہا جاتا ہے وہ عوام کی مالک نہیں ہوگی بلکہ ان کی بنائی ہوئی چیز ہوگی اس کا باقی رکھنا اور ختم کر دینا ان کی مرضی پر ہوگا۔ حکومت کے قاعدے اور ضابطے بھی انھیں عوام کے بنائے ہوئے ہوں گے۔ جو خود اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کا خیال رکھتے ہوئے بنائیں گے۔ حکومت کے کارپرداز عہدہ دار اور ذمہ دار بھی عوام ہی میں کے ہوں گے۔ انھیں کے بھائی بند اور انھیں کے برابر کے دوست، ان کو کام کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ انسانوں کا مالک یا آقا نہیں بنایا جاتا۔ اپنے جیسے انسانوں کو اپنا مالک اور آقا مان لینا غلط ہے۔ مالک اور آقا صرف اللہ رب العالمین ہے کیونکہ اس نے پیدا کیا اور وہی پرورش کرتا ہے پس سچا بادشاہ وہی ہے۔ ایسا حکم جس میں سارے انسانوں اور تمام مخلوقات کے لئے یکساں انصاف ہو۔ صرف اسی کا حکم ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک ضرورت سے بے نیاز، ہر ایک غرض سے پاک ہے۔ اس کو نہ کسی کی بغاوت کا ڈر ہے نہ کسی ٹیکس کی حاجت۔ وہ خود روزی پہنچانے والا ہے۔ ہر ایک کی بگڑی بنانے والا۔

---

[1] ایک کاشتکار زراعت کے لئے لوہار اور بڑھئی کا محتاج ہوتا ہے۔ کپڑوں کے لئے بنکر کا۔ برتنوں کے لئے کمہار کا وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال یہ حکومت جو عوامی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک بندھن ہے یا ایک ادارہ ہوگا، انسانی مساوات اور انسانی بھائی چارہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کو ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ

(۱) ہر انسان کی جان و مال اور اس کی عزت و آبرو محفوظ رہے۔

(۲) عدل و انصاف کے جو اصول بنائے جائیں، ہر انسان یکسانیت کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

ترجمان نے کہا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ اصول من جانب اللہ[1] ہوں، کیونکہ انصاف سے بھرپور اور بے لاگ اصول اسی امی کے بنائے ہوئے ہو سکتے ہیں[2]۔

---

[1] إن الحكم إلا لله (سورہ یوسف) ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون (سورہ مائدہ)۔

[2] جمہوریت جس کو تمام باشندگان ملک کے جذبات کا آئینہ دار کہا جاتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے اصول بھی کسی غرض اور دشمنی پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک ملک کے جمہور دوسرے ملک کے دشمن ہوں ان کو نقصان پہنچانے ہی میں اپنا فائدہ سمجھتے ہوں۔ پھر جمہوری حکومت میں اگرچہ نام جمہور کا ہوتا ہے مگر پورے ملک اور باشندگان ملک کے کاموں کی باگ ڈور چند منسٹروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ منسٹر عموماً وزیر اعظم کے اشاروں پر کام کرتے رہتے ہیں۔

پس حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کی آڑ میں عموماً شخصی حکومت کا تجربہ ہوا کرتا ہے قانون بنانے کے متعلق یہ ہی ہوتا ہے کہ چند وزراء کے ہاتھ میں مسودہ تیار کرنا ہوتا ہے جو مسودہ تیار کر لیتے ہیں وہ سرکاری بل کی حیثیت میں پارلیمنٹ میں پیش ہوتا ہے اور پارلیمنٹ اس کو عزت کے ساتھ تسلیم کر لیتی ہے۔

(۳) دین و مذہب کے بارے میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہو۔ ہر ایک[۱] کو حق ہو کہ آزادی کے ساتھ غور و فکر کرے پھر جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

(۴) حکومت اور حکومت کے ذمہ داروں کے خلاف نکتہ چینی کا ہر ایک کو حق ہو۔

(۵) تعلیم کی آزادی ہر ایک کو حاصل ہو۔ ہر ایک کو موقع ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ قابلیت پیدا کرے اور ترقی کی منزلیں طے کر سکے۔

(۶) مادری زبان کو ترقی دینے، خاندانی روایات کی حفاظت و عظمت اور اپنی تہذیب کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے مواقع یکسانیت کے ساتھ ہر قوم و ملت اور ہر برادری کو حاصل ہوں۔

(۷) کاروبار کی آزادی ہر ایک[۲] کو حاصل ہو جہاں چاہے جائیداد پیدا کر سکے، اس کی خرید و فروخت کر سکے۔

(۸) امیری اپنے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ لہذا ہر ایک کو امیر بنانا تو حکومت

---

[۱] لیکن مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ معاذ اللہ اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔ دار الاسلام میں (جہاں اسلامی حکومت ہو) اس کو گردن زدنی مجرم قرار دیا جائیگا کیونکہ وہ صرف مذہب سے برگشتہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ حلف وفاداری کی خلاف ورزی اور اپنی حکومت سے بغاوت بھی کر رہا ہے جس کی سزا موت ہوتی ہے۔ جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں صرف آخرت کا عذاب ہے یا سوشل بائیکاٹ جس کا تعلق اپنے کنبے قبیلے سے ہوتا ہے۔ نکاح کا ٹوٹ جانا بھی سوشل بائیکاٹ ہی کی ایک کڑی ہے۔

[۲] اسلامی حکومت میں اگر پابندی ہوتی ہے تو خود مسلمانوں پر کہ وہ شراب یا خنزیر کی تجارت نہیں کر سکتے۔

کے ذمہ نہیں ہوگا۔ البتہ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی محنتی روزگار سے محروم نہ رہ سکے اور جو محنت مزدوری سے معذور ہوں ان کو روزینہ مل سکے۔

(۹) مفادِ عام کی چیزیں جو کسی کی مِلک نہ ہوں۔ مثلاً دریا، کنواں، جنگل ان سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکے۔

گھرستی

جناب صدر۔ انسانی مساوات اور انسانی بھائی چارہ پر جب ہم بحث کرتے ہیں تو ہماری نظر نظامِ حکومت جیسے شاندار عنوانات پر پڑتی ہے۔ مگر وہ نہایت ضروری چیز نظرانداز ہو جاتی ہے جو تمام شان دار عنوانوں کی تمہید اور انسانی بھائی چارہ کی سب سے اونچی منزل کی بنیادی اینٹ ہے۔ گھریلو زندگی جس کو ہم معمولی بات سمجھتے ہیں۔ وہ ایک بنیاد ہے۔ ہم انسانی برادری کے لئے جو عمارت بھی تعمیر کرنا چاہیں اس کی پہلی اینٹ یہی ہے۔

ہم جب انسانی مساوات کے دامن پھیلاتے ہیں تو ماؤں اور بہنوں کا سوال بھی سامنے آتا ہے کہ ان کو برابر کی حیثیت حاصل ہے یا نہیں۔

میں پورے وثوق اور یقین سے کہتا ہوں کہ ان کو برابر کی حیثیت حاصل ہے آپ قرآن مجید کے اس اعلان کا مطالعہ کیجئے، پھر غور کیجئے کہ مردوں اور عورتوں کی برابری کی حیثیت میں کیا فرق ہے۔ اعلان یہ ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (سورہ بقرہ ع ۲۸) عورتوں کے

بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔

درجہ کی حقیقت

البتہ اگر کوئی لچک ہے تو وہ اس بنا پر نہیں کہ ان کی انسانیت میں فرق مانا جاتا ہے یا عورت کو مرد کا مملوک اور لونڈی فرض کیا جاتا ہے۔ بلکہ لچک اس بنا پر ہے کہ قدرت نے خود عورت کی فطرت میں لچک اور نزاکت رکھی ہے۔

بزرگان محترم۔ اسلام جو دین فطرت ہے۔ وہ فطرت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس نے انسانی مساوات اور صنف نازک کی فطری لچک کا نہایت احتیاط سے موازنہ کرتے ہوئے یہ تو کر دیا کہ عورت کے فرائض میں تخفیف کر دی مگر ذمہ داری اور جواب دہی جو عقل و شعور کی بنا پر انسانی خصوصیت ہے اس میں فرق نہیں آنے دیا۔

عورتوں کی ذمہ داریاں

جہاد جیسا فرض عورتوں کے ذمہ نہیں ڈالا کہ اس کی نازک فطرت اس کو برداشت نہیں کر سکتی اور اس بنا پر حکومت اور خلافت کی باگ ڈور بھی ماؤں بہنوں کے حوالہ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ خلیفہ وہ ہونا چاہیئے جو خود بھی جہاد کے موقع پر پیش پیش رہ سکے اور بہادری کے جوہر دکھا سکے۔ اس سے علاوہ نظام حکومت کی کوئی بھی ذمہ داری ان محترمات کے لئے ممنوع نہیں ہے۔

مگر اس موقع پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ ایک طرح کی علمی موشگافی اور گرمی مجلس کی بات ہے کہ یہ سوال اٹھایا جائے، عورت خلیفہ بن

سکتی یا نہیں۔ یا مثلاً جج بن سکتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب ہم ہر انسان کو بھائی بھائی سمجھیں اور اسی بھائی چارہ اور مساوات کی بنیاد پر ملک اور قوم کی تعمیر کرنا چاہیں تو ہمارے سامنے سب سے مقدم اور ضروری سوال یہ ہونا چاہیے کہ اس کی تعمیر میں ہماری ماؤں بہنوں کا حصّہ کیا ہو؟ قوم اور ملّت کے بنانے میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہوں اور کس طرح ان کی خدمت سے پوری قوم فائدہ اٹھائے۔

ایک رجحان یہ ہے کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح معاش پیدا کریں۔ سرکاری ملازمتوں میں حصّہ لیں اور گھریلو زندگی کے بجائے دفتری زندگی اختیار کریں۔ بے شک عورتوں کو یہ آزادی میسر ہے۔ وہ ایسا کر سکتی ہیں۔ اس سے آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ مگر جہاں تک سماجی زندگی کی خوش گواری اور قومی اور ملّی زندگی کی اصلاح کا تعلق ہے۔ اس میں بے حد دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ کیونکہ گھریلو زندگی جو ادب تہذیب۔ سلیقہ، امداد باہمی، ہمدردی اور میل ملاپ کی تعلیم اور عملی مشق کا سب سے پہلا مکتب ہے، اس کی خوبی عورت کی ذات سے ہے اور اس کی کامیاب معلّمہ مائیں اور بہنیں ہی ہیں۔ جب وہ گھر چھوڑ کر دفتر یا کارخانہ میں جائیں گی تو ان کی غیر حاضری اس بنیادی مکتب کو تباہ کر دے گی۔

عزیزانِ محترم۔ اپنوں سے محبت رشتہ داروں سے اچھا سلوک بڑوں کا ادب۔ چھوٹوں پر شفقت۔ آنکھ کا لحاظ۔ مروت۔ وفاداری۔ ایک دوسرے کی امداد۔ ہمدردی۔ غم خواری۔ یہ وہ جوہر ہیں جو انسانی شرف

وعظمت کی جان اور انسانی بھائی چارہ کی روح رواں ہیں ۔ اگر گھریلو زندگی کا شیرازہ اس طرح بکھر جائے کہ عورتیں دفتروں میں جائیں ۔ مرد کارخانوں میں ڈیوٹی انجام دیں ۔ بچوں کو سرکاری پرورش گاہوں کے حوالے کر دیا جائے جو بیمار پڑے اس کو ہسپتال پہنچا دیا جائے ۔ تو آپ ہی بتائیں کہ انسانیت اور تہذیب و شرافت کے یہ انمول موتی اس نئی پود کو کہاں سے نصیب ہوں گے ۔ پھر اگر یہ بچے بڑے ہوکر وحشیوں کی طرح محبت و الفت سے خالی ، طوطا چشم وفاداری اور مروت سے ناآشنا ہوں ۔ اپنی خواہشات پوری کر لینا ان کی زندگی کا نصب العین ہو تو اس طرح انسانی بھائی چارہ وجود میں آئے گا یا اس کے برعکس بے رحی ، بے مروتی ، نفرت و وحشت و بربریت ۔ حیوانیت اور درندگی ، انسانوں میں ترقی کرے گی ؟ اسلام نے اسی عظیم ترین مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ملت کی تعمیر و ترقی جس طرح مرد کے ذمہ رکھی ہے ۔ عورتوں کو بھی برابر کا ذمہ دار قرار دیا ہے ۔ البتہ فرائض کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ مرد پورے کنبہ کا ذمہ دار ہے گویا وہ وزیر اعظم ہے اور اندرون خانہ اولاد کی تربیت ۔ اعزار و اقارب سے حسن تعلق ۔ رشتہ داروں کا پاس و مروت ۔ مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے گھریلو مصارف کا نظم و ضبط ، یہ سب عورت کے ذمہ کیا ہے ۔ گویا عورت وزیر داخلہ (ہوم منسٹر) ہے ۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک ــــــ کی ذمہ داری کی تفصیل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ۔

"مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار اور ان کا نگراں ہے اس سے ان کے بارے میں بازپرس ہوگی ۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور

شوہر کے اہل و عیال کی ذمہ دار اور نگراں ہے عورت سے اس کی ذمہ داری کے متعلق بازپرس کی جائے گی۔"

اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بعد ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور فرائض کی تقسیم اس طرح فرمائی کہ باہر کی ضروریات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمے رکھیں اور گھر کی تمام ضرورتیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ذمہ کر دیں۔

بہرحال گھریلو زندگی کی بنیاد مکتب ہے۔ آپ اخوت، انسانی بھائی چارہ، محبت و شفقت، حسنِ سلوک اور جمہوریت وغیرہ کا جو نصب العین بھی کا میابا کرنا چاہیں، آغوشِ مادر اس کی بنیادی تربیت گاہ ہے۔ اس کی اصلاح پوری قوم کی اصلاح ہے اور اس کی مضبوطی اور باضابطگی پوری قوم کی مضبوطی ہے۔

وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ

انسانی بھائی چارہ اور کاروبار

ایک پینٹھ کی سیر اور اس سے سبق

ایک روز اس کانفرنس میں اس پر بحث کی گئی کہ کیا انسانی بھائی چارہ کا کاروبار سے کچھ تعلق ہے۔

کانفرنس کے ارکان کا عام خیال یہ تھا کہ کاروبار کا منشا نفع حاصل کرنا ہے۔ بھائی چارہ دوسروں کو نفع پہنچانے کے لئے ہوتا ہے۔ پس یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

لیکن کچھ ارکان ایسے بھی تھے جو کاروبار اور بھائی چارہ میں بہت گہرا تعلق ظاہر کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ بھائی چارہ کا مقصد ہے ایک دوسرے کی امداد اور ہمدردی۔ اور کاروبار کی خوبی کا معیار بھی یہی ہے کہ وہ تعاون اور امداد باہمی کی بنیاد پر ہو۔ یہاں تک کہ وہ کاروبار ہی صحیح نہیں ہے جو امداد باہمی کی چاشنی سے خالی ہو۔

کانفرنس میں دیر تک بحثیں ہوئیں اور کانفرنس کا ایک اجلاس اس بحث میں ختم ہو گیا۔ تمام بحثوں کو نقل کرنا طول لاطائل[1] اور بیکار ہے۔ یہاں صرف بلاک[1]

---

[1] طول لاطائل عربی لفظ ہے۔ اردو میں بھی بولا جاتا ہے۔ لفظی تشریح یہ ہے کہ طول یعنی درازی۔ لا۔ نفی کا لفظ ہے۔ نہیں کے معنی میں ہے۔ طائل کے معنی فائدہ۔ طول لاطائل کہ گفتگو کی ایسی درازی جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔

کے نمائندہ کی تقریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی چیز ہے۔

بلاک ۳۱ کے نمائندہ نے تقریر کے شروع میں ایک بازار کی سیر کا تذکرہ کیا۔ نمائندہ نے کہا:

یہاں سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ان اونچے اونچے برفانی پہاڑوں پر اگرچہ آبادیاں ہیں۔ مگر ان تک پہنچنے کیلئے نہ ریلوے لائن ہے نہ کوئی پختہ سڑک۔ پہاڑی گھاٹیوں اور پھسلواں پگڈنڈیوں سے گزر کر ان آبادیوں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ڈاک تار اور بجلی وغیرہ کا بھی وہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہاں کے رہنے والے گویا دو سو برس پہلی دنیا میں رہتے ہیں۔

ان پہاڑوں کے بیچ میں ایک موضع "غیاث پور" ہے۔ وہ گویا اس علاقہ کا مرکز ہے یہاں ہر جمعرات کو بازار لگتا ہے۔ اس کو یہاں والے "ہاٹ یا پینٹھ" کہتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی سیر اور یہاں کی عجیب عجیب باتیں معلوم کرنے کے لئے میں چند دوستوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ بازار کا دن تھا۔ میں بازار میں بھی پہنچا۔ ایک میدان میں لوگوں نے چٹائیاں، ٹاٹ یا چادریں بچھا کر ان پر اپنا اپنا سامان رکھ لیا تھا۔ یہ دوکانیں تھیں۔ کسی کسی نے دھوپ سے بچنے کے لئے ان پر چادریں یا کمبل بھی تان لئے تھے۔

اس علاقہ کے رہنے والے اگرچہ دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں مگر ان کو ضرورت ہر چیز کی پڑتی ہے۔ نمک۔ مرچ۔ مصالحہ کے علاوہ پہننے اور اوڑھنے کے لئے کپڑے۔ کھانے کے لئے دال، گوشت، ترکاری۔ جلانے کے لئے مٹی کے

تیل، ماچس وغیرہ۔ غرض ہر چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔

آنے والے دوکان دار یہاں کی ضرورت کی سب چیزیں لے کر آتے ہیں یہاں کے پہاڑی باشندے بازار کے منتظر رہتے ہیں اور جیسے ہی جمعرات آتی ہے ہفتہ بھر کی ضروری چیزیں باہر سے آنے والے دوکان داروں سے خرید لیتے ہیں۔

یہاں کے باشندے عام طور پر کاشتکار ہیں۔ کچھ پیشہ ور یعنی بُنکر بڑھئی۔ لوہار۔ کمہار وغیرہ ہیں۔ تھوڑی تھوڑی زمینیں بھی ان کے پاس ہیں، ان کو بو لیتے ہیں جس سے سال بھر کی ضرورت کا غلّہ پیدا ہو جاتا ہے جس کے پاس ضرورت سے زیادہ غلّہ پیدا ہوتا ہے وہ اس کو فروخت بھی کر دیتا ہے۔

میں نے یہاں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ لوگوں کے پاس روپیہ پیسہ بہت کم ہے۔ اکثر عورتیں اور بچے اپنے گھر سے اناج لے آتے ہیں اور اسی کے بدلہ میں چیزیں خریدتے ہیں۔ کسی دوکان دار کے پاس ترازو ہے اور کوئی کچھ پیمانے رکھے ہوئے ہے۔ یہ لوگ ترازو یا پیمانے سے غلّہ کے وزن کا اندازہ کرتے ہیں اور پھر اس کی قیمت کے حساب سے سودا دے دیتے ہیں۔ ایک شخص آم بیچ رہا تھا وہ قلمی آم غلّہ کے برابر دے رہا تھا اور تخمی آم دوگنے۔ وہ ترازو کے ایک پلّہ میں گیہوں ڈال لیتا تھا قلمی آم اس کی برابر تول کر دے دیتا تھا اور تخمی آم ایک دفعہ تول کر پلّہ خالی کر لیتا، پھر خالی پلّہ میں آم چڑھاتا اور دوسری دفعہ تول کر دے دیتا تھا۔

میں دیر تک وہاں گھومتا رہا۔ کپڑا، جوتہ، مصالحہ، برتن یہاں تک کہ چوڑیوں کی دوکانیں بھی وہاں موجود تھیں اور اسی طرح خرید و فروخت ہو رہی تھی جیسے قصبوں یا شہروں میں ہوتی ہے۔

پہاڑی لوگ جو اُون، کمبل، جانوروں کی کھال، اون یا چمڑے کی چیزیں ہفتہ بھر بناتے رہتے ہیں وہ بھی اپنی کاریگری کی چیزیں بازار میں لے آئے تھے۔ کسی نے کسی دوکان دار کے ہاتھ اپنی چیز فروخت کی کسی نے کسی دوسرے گاہک کے ہاتھ۔ شام ہونے لگی۔ دوکان داروں نے دوکانیں بڑھائیں، سودے کے بدلہ میں جو غلہ لیا تھا وہ خچروں اور گدھوں پر لادا اور اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

جناب صدر: میں نے بازار کی سیر کی۔ روئداد اس لئے بیان کی کہ میں نے جو اس سے سبق لیا وہ کانفرنس کے سامنے پیش کرسکوں۔

غور و فکر کی طاقت اور قوت ایجاد جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو بخشی ہے وہ اسے آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

جان پہچان، میل ملاپ، پریم اور محبت جو انسانی فطرت کا جوہر ہے وہ اس کو مِل جل کر رہنے، گاؤں اور شہر آباد کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کو عربی میں "مدنیت" اور ہماری زبان میں "شہریت" کہا جاتا ہے۔

قوت ایجاد، شوق ترقی اور جذبۂ مدنیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسانی ضرورتوں کا دامن دن بدن پھیلتا رہتا ہے۔ ان پہاڑوں میں انسانوں سے زیادہ طرح طرح کے جانور رہتے ہیں۔ مگر ان کا نہ گاؤں ہے نہ ان کا بازار لگتا ہے۔ نہ اُن کے یہاں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ کیوں کہ نہ ان میں قوت ایجاد ہے نہ شوق ترقی اور نہ جذبۂ مدنیت۔

شیر کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بادشاہ سلامت جس طرح جھاڑیوں کے جھاوہ میں ہزاروں سال پہلے رہا کرتے تھے اب بھی اسی طرح رہتے

ہیں۔ کیونکہ جس طرح شیر میں غور و فکر اور قوت ایجاد نہیں ہے۔ اس میں ترقی کا جذبہ بھی نہیں ہے اور ہم جنسوں سے ایسی محبت بھی نہیں ہے کہ تنہائی کو موت سمجھے۔ اور ساتھ رہنے پر مجبور ہو۔ لیکن انسان بل تو کیا جھونپڑی اور چھپر کی رہائش بھی برداشت نہیں کرسکا۔ اس نے پہلے کچی دیواروں اور کڑیوں کی چھت کا مکان بنایا۔ پھر پختہ مکان پھر کوٹھی۔ بنگلے۔ عالی شان محلات اور قلعے تعمیر کئے۔ پھر جیسے جیسے تعمیر کا قدم آگے بڑھتا رہا، ضرورتوں کا دامن بھی وسیع ہوتا رہا۔ جھونپڑی کے لئے پھونس، بانس اور رسی کے چند ٹکروں کی ضرورت تھی۔ مگر اب اینٹ۔ پتھر، لوہا۔ لکڑی چونا۔ سیمنٹ، نقشے، انجنیئر "آرکی ٹیکٹ" ڈیزائن وغیرہ وغیرہ خدا جانے کتنی چیزوں کی ضرورت پیش آگئی اور جیسے جیسے یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں انسانی تجربات کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہا۔

جناب صدر، میں نے اس ہاٹ کی سیر کی اور اس کی ہر چیز کا غور سے مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کی ترقی پذیر زندگی کے لئے تعاون اور امداد باہمی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ کیونکہ انسان کی وہ بے شمار ضرورتیں جن کا دامن دن بدن بڑھ بڑھ رہا ہے اور جن کے لئے طرح طرح کی ایجادیں ہو رہی ہیں ان سب کو ایک انسان تن تنہا تیار نہیں کرسکتا۔ ایک کاشتکار کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خود ہی آہنگر [1]۔ نجار۔ کمہار۔ پارچہ باف۔ معمار یا حکیم اور عطار بھی ہو، حالانکہ اس کو ان میں سے ہر ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔

انھیں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تبادلہ کا طریقہ ایجاد ہوا۔ جس کو ہم

---

[1] آہنگر۔ لوہار۔ نجار۔ بڑھی۔ پارچہ باف۔ کپڑا بننے والا

تجارت کہتے ہیں۔ یعنی ایک جنس کو دے کر اس کے بدلہ میں دوسری جنس لے لینے کا کاروبار۔

جناب والا۔ میں نے یہ سبق بھی لیا کہ جس طرح کاشتکار نے بہت بڑی خدمت انجام دی کہ غلّہ پیدا کیا جو ہماری غذا ہے۔ جس پر ہماری زندگی کا مدار ہے۔ اسی طرح اس نے بھی بہت بڑی خدمت انجام دی جس نے غلّہ کو کاشتکاروں سے لیا اور ہمارے بازاروں تک پہنچایا۔

میں ان دوکان داروں کو بھی دیکھ رہا تھا جو گدھوں، خچروں اور گھوڑوں پر گاؤں والوں کی ضرورت کا سامان لاد کر یہاں صبح سویرے پہنچ گئے تھے۔ وہ رات بھر گھوڑوں اور گدھوں کے پیچھے ان پہاڑی پگڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ کہیں کہیں وہ پھسل کر گر بھی گئے۔ انھوں نے اگرچہ اپنے نفع کی خاطر یہ مصیبت اٹھائی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موضع "غیاث پور" اور اس کے پاس کے باشندوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی کہ ان کی ضرورت کی چیزیں، ان کے گھروں تک پہنچا دیں یہ گویا ان کی ضرورتوں کے لئے ابر رحمت بن گئے۔

موضع غیاث پور کے کاشتکار نے یہاں چند منٹ صرف کر کے مٹی کے تیل کا پورا کنستر خرید لیا۔ جو دوکان دار یہاں لایا تھا اور ایک روز جب اسی کاشتکار کو چند تولہ مٹی کے تیل کی ضرورت تھی تو کئی میل طے کر کے اس کو بازار جانا پڑا تھا جانے آنے میں وقت صرف ہوا۔ محنت اٹھائی۔ کام کاج کا ہرج ہوا۔

جناب صدر اور اراکین کانفرنس صرف نیت کا پھیر ہے۔ دوکان دار کے سامنے اگر صرف اپنا نفع ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ سے پرہیز نہیں کرتا۔ وہ ملاوٹ

بھی کرتا ہے۔ دام بھی بڑھا چڑھا کر بتاتا ہے اور موقع ملتا ہے تو ڈنڈی بھی مار لیتا ہے کہ گاہک کے پلّہ میں سودا کم پڑے اور دام پورے وصول کرے اور اس کو اس سے بھی شرم نہیں آتی کہ ضرورت کی چیز کو بند کر کے رکھ دے اور حاجتمند کی حاجت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوگنی چوگنی قیمت پر وہ چیز بیچے۔ لیکن اگر دوکان دار میں خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ وہ تجارت خدمت خلق کی نیت سے کرتا ہے اور اس کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفع کے ساتھ دوسروں کو بھی نفع پہنچائے اور تجارت اور کاروبار کے اصلی مقصد کو کامیاب بنائے تو وہ دام بتانے۔ ناپنے تولنے۔ لینے اور دینے میں ایمان داری سے کام لیتا ہے۔ اس کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ کوشش اور محنت کر کے اچھا مال حاصل کرے اور سستے داموں پر خریدار کو پہنچائے۔ وہ اس بات کو بہت بڑی خیانت اور خلق خدا کے ساتھ غداری سمجھتا ہے کہ ضرورت کی چیز کو بند کر کے رکھ دے کہ دام اور بڑھ جائیں تب وہ فروخت کرے گا

وہ اس کو حرام سمجھتا ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت سے فائدہ اٹھائے اور پیسہ کی چیز کے دس پیسے وصول کرے۔ الّا یہ کہ بازار کا بھاؤ یہی ہو جائے۔

جناب صدر۔ مجھے مسرت ہے کہ جب میں نے اس ہاٹ کی سیر میں چند گھنٹے صرف کر کے ہر چیز کو پرکھا اور گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات کا مطلب میری سمجھ میں آگیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجر کی بہت تعریف فرمائی ہے یہاں تک کہ آپ کا ارشاد ہے:

"سچا امانت دار تاجر قیامت کے روز انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا"

ایک دوکان دار کی یہ شان کہ وہ قیامت کے دن ان کے ساتھ ہو جو نوع انسان میں سب سے افضل مانے گئے ہیں۔ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلق خدا کی خدمت۔ بندگان خدا کی ضرورتیں پوری کرنا، اڑے وقت میں اُن کے کام آنا۔ جو نبیوں، ولیوں اور شہیدوں کی خصوصیت ہے۔ یہی کام ایک خاص ڈھنگ سے یہ تاجر بھی کر رہا ہے، پس کوئی تعجب نہیں اگر اس کا حشر بھی انھیں کے ساتھ ہو۔ ہاں شرط ہے سچائی اور امانت داری۔ لیکن اگر خلق خدا کی خیرخواہی، سچائی اور امانت داری کے بجائے خودغرضی اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا مدنظر ہے تو یہ فضیلت اس کو میسر نہیں ہوگی بلکہ اگر اس کی خودغرضی خریدار کو غیر معمولی نقصان پہنچا رہی ہے تو فضیلت تو درکنار یہ تاجر معاذاللہ لعنت کا مستحق ہو رہا ہے۔

چنانچہ دوسرے موقع پر ارشاد ہوا ہے اَلْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ (صحاح) یعنی سوداگر ضرورت کا سامان دوسری جگہ سے لاکر یہاں فروخت کرتا ہے خلق خدا کو فائدہ پہنچائے تو اللہ تعالیٰ اس کو برکتیں عطا فرماتا ہے اور جو شخص ضرورت کے وقت ضرورت کی چیز روک لیتا ہے کہ لوگ پریشان ہوکر زیادہ دام دیں اور یہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرے تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا۔ (معاذاللہ)

قرآن حکیم میں جس طرح دوزخ کے ان ہولناک اور ایذا دینے والے عذابوں کو بیان کیا گیا۔ جو خدا کے باغی مشرکوں اور کافروں کو قیامت کے روز دیئے جائیں گے اتنی ہی قوت اور شدت سے اس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے جو ڈنڈی مارنے والے

دوکان داروں اور سوداگروں کے لئے ٹلے ہے

ارشاد ہوا ہے:

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ۔ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(پارہ ۳۰)

ویل۔ تباہی اور بربادی ان گھٹانے والوں کے لئے کہ جب وہ اپنے لئے ناپتے ہیں تو لوگوں سے پورا پورا ناپ کر وصول کرتے ہیں اور جب ناپ کر دیں، تول کر دیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ خیال نہیں رکھتے کہ ان کو اٹھایا جائے گا ایک بہت بڑے ہولناک دن میں جس دن لوگ رب العالمین کے حضور میں حاضر ہوں گے۔

جن قوموں پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ دنیا میں برباد کر دی گئی ہیں ان میں حضرت "شعیب" کی قوم کا بھی تذکرہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔ اس قوم کی وہ خراب خصلتیں جن کی بنا پر یہ قہر الٰہی کی مستحق ہوئی۔ اُن میں ڈنڈی مارنے کی خصلت بھی تھی۔ قرآن شریف میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی "ناپ تول میں کمی مت کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوش حال ہو۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا" (سورہ ہود ع ۸) بہر حال سچائی، امانتداری اور گاہک کی خیر خواہی یہ خصوصی اوصاف ہیں جو تاجر کے لئے ضروری ہیں اور انھیں اوصاف کی بنا پر اللہ کے یہاں اس کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجر کے اچھے اور برے اوصاف کی توضیح فرمادی ہے۔ یہ حدیث ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

پیشہ تجارت سب سے بہتر اور پاکیزہ پیشہ ہے مگر شرط یہ ہے
کہ تاجر بات چیت میں جھوٹ نہ بولیں۔ امانت میں خیانت نہ
کریں۔ وعدہ کی خلاف ورزی نہ کریں۔ خریدتے وقت سودے کی
مذمت نہ کریں (کہ خرابیاں نکال کر کم قیمت کرائیں) بیچنے کے وقت
تعریف نہ کریں (کہ غلط تعریف کرکے قیمت بڑھائیں) جب ان پر
کسی کا مطالبہ ہو تو اس کے ادا کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ انکا مطالبہ
جو کسی کے ذمہ ہو اس کو وصول کرنے کے لئے تنگ نہ کریں۔

(بیہقی وغیرہ)

سوداگر: وہ درمیانی کڑی ہے جس کے ذریعہ ایک کی محنت کا پھل دوسرے
تک پہنچتا ہے۔ اس کو زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر قرآن شریف اور
احادیث میں تاجر کے متعلق زیادہ وضاحت سے ارشادات صادر ہوئے ہیں۔ ان
کے علاوہ وہ سب جو کسی بھی صورت سے محنت کرکے انسانی برادری کی ضرورت کی
چیزیں تیار کرتے ہیں وہ انسانی برادری کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ احادیث میں
ان کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مثلاً دستکاریوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ المؤمن المحترف (جمع الفوائد)

اللہ تعالیٰ دستکار مسلمان سے محبت فرماتا ہے

کاشتکار کو بشارت دی گئی ہے

مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ یَزْرَعُ زَرْعًا فَیَاْکُلُ مِنْہُ طَیْرٌ

اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَ لَهٗ بِهٖ صَدَقَه (صحاح)

ترجمہ :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی مسلمان درخت لگائے یا کھیتی بوئے اور اس سے کوئی پرندہ یا آدمی یا چوپایہ کچھ کھائے تو وہ صدقہ شمار ہوگا۔

مثال اور نمونہ تجارت کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھانے کے لئے حضرت ابوحنیفہ کے دو واقعے نقل کرتے ہیں۔ حضرت ابوحنیفہ جس طرح مذہبی مسائل کے اتنے بڑے عالم تھے کہ ان کو " امام اعظم " (یعنی منشار شریعت کو سمجھنے والوں میں سب سے بڑے فاضل اور رہنما) کہا جاتا ہے۔ ایسے ہی وہ بہت بڑے تاجر بھی تھے۔ ریشمی اور اعلیٰ قسم سوتی کپڑے کا کاروبار بہت بڑے پیمانہ پر ان کے یہاں ہوتا تھا۔ ملک میں جگہ جگہ ان کی ایجنسیاں تھیں۔ واقعہ یہ ہے۔

(۱) ایک ضرورت مند عورت تھان لے کر آئی اور سو روپیہ اس کی قیمت مانگی۔ امام صاحب نے تھان دیکھ کر فرمایا۔ سو روپیہ قیمت کم ہے۔ عورت نے کہا دو سو دید یجئے۔ فرمایا نہیں۔ یہ تھان پانچسو کا ہے۔ امام صاحب نے سو روپیہ مانگنے والی کو پانچسو روپے دیئے تب تھان لیا۔

(۲) کچھ تھان ایسے تھے جن میں اندر کی طرف کچھ خرابی تھی جب وہ تھان ایجنٹ کو دیئے گئے تو تاکید کر دی گئی کہ گاہک کو پہلے یہ خرابیاں دکھا دینا تب بھاؤ کرنا۔ ایجنٹ صاحب امام صاحب کی ہدایت بھول گئے اور تھان بیچ ڈالے۔ خریدار ایک مسافر تھا وہ بھی قافلہ میں روانہ ہوگیا۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو ایجنٹ کو فوراً واپس بھیجا وہ منزلیں طے کر کے خریدار کے پاس قافلہ میں پہنچا خریدار کو خرابی بتائی پھر معاملہ کر کے قیمت لی۔ ایک مرتبہ ایک اور واقعہ ایسا ہی ہوا اس مرتبہ تلاش کرنے پر بھی خریدار نہیں ملا تو امام صاحب نے تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار تھی خیرات کر دی۔

پیداوار کس کی ہے

کانفرنس میں ایک سوال یہ بھی زیر بحث تھا کہ پیداوار کس کی ملک ہے۔ روپیہ لگانے والے کی یا محنت کرنے والے کی یعنی ایک دولت مند نے مثلاً کپڑے کا کارخانہ قائم کیا۔ سوت فراہم کیا۔ ڈیزائن بنوایا۔ یا خود ہی کوئی نمونہ تجویز کیا۔ بنکروں نے اس نمونہ کے مطابق کپڑا تیار کیا۔ تو کپڑے کے یہ تھان جو اس کارخانہ کی پیداوار ہیں، کس کے مانے جائیں۔ اس دولت مند کے یا بنکر کے۔

عام خیال یہی تھا کہ یہ تھان دولتمند کے ہیں اس کو اختیار ہے کہ اپنے کام میں لائے یا فروخت کر کے ان کی قیمت محفوظ کرے جو پوری کی پوری اس کی اپنی ملک ہوگی اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ فی الحال کپڑا تیار کرا کے محفوظ رکھے جب بازار میں اس کا کال پڑ جائے تو اس کو چارگنی، پانچ گنی، دس گنی قیمت پر بیچ دے۔ رہا بنکر تو وہ صرف ایک مزدور ہے۔ اس سے جو اجرت طے ہوئی تھی وہ اس نے وصول کرلی اپنا پیٹ پال لیا۔ اس کا تعلق پیداوار سے کچھ نہیں رہا۔

اگر وہ بوڑھا ہوگیا یا بیمار ہوگیا یا کوئی اور ضرورت پیش آگئی ہے جس سے وہ کام نہیں کرسکا تو اس کو اجرت کا بھی حق نہیں ہے۔ اب یہ اس کے مقدر کی بات ہے کہ خواہ وہ کسی سے قرض ادھار کرکے خالی انتڑیوں کے لئے روکھے سوکھے چند نوالے فراہم کرلے یا قرض نہ لے اور فاقہ کرتا ہوا زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جائے۔

دوسرا نظریہ یہ تھا کہ پیداوار اس کی ہے جو اپنی محنت سے اسے پیدا کر رہا ہے

اس نظریہ کے ماننے والوں کی دلیل یہ تھی کہ یہ تو بہت بڑا ظلم ہے کہ وہ مزدور جو جان کھپا رہا ہے۔ کبھی رات کی ڈیوٹی پر حاضر ہو کر نیند خراب اور صحت برباد کرتا ہے کبھی دوپہر کی گرمی میں خون پسینہ ایک کر کے بدن کی چولیں ڈھیلی کرتا ہے۔ اس کا حصہ صرف چند لقمے ہوا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ پوری جفاکشی اور محنت سے کام کرے۔

اور جو دولت مند رات کو عیش و عشرت کی داد دیتے ہوئے آرام سے سویا صبح کو اطمینان سے سیر کی۔ عمدہ ناشتہ کھایا۔ دوست احباب کے ساتھ ہر طرح کی خوش طبعی کی۔ دن کو ٹھنڈے کمرے میں آرام سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ محنت صرف اتنی کہ کاروباری سلسلہ کے خطوط لکھوا دیئے یا آرڈر بک کرا دیئے۔ کچھ حسابات چیک کر کے دستخط کر دیئے۔ وہ صرف اس بنا پر کہ اس نے کچھ رقم جو اس کے پاس فاضل پڑی ہوئی تھی، اپنی تجوری سے نکال کر کچھ کل پرزے خرید لئے ہیں۔ جن سے یہ مزدور کام کرتا ہے۔ مزدور کی ساری محنت کا مالک ہو گیا۔

کسان کی بپتا کارخانہ کے مزدور سے بھی زیادہ دلخراش ہے۔ جو شخص زور زبردستی یا کچھ روپیہ خرچ کر کے یا باپ دادا کے ترکہ میں زمین کا مالک بن گیا وہ گویا کسان کا بھی مالک ہے۔ کسان، اس کی بیوی اور چھوٹے بڑے بچے رات دن کھیت میں لگ کر جو کچھ پیدا کرتے ہیں وہ سب زمیندار کا ہے۔ عمدہ غلہ جو اس کسان نے ہی پیدا کیا ہے وہ صرف مالک کا ہے۔ موٹا خراب غلہ جو گھوڑوں اور بیلوں کے دانہ کے کام میں آتا ہے اس میں اس غریب کسان کا بھی حصہ ہے مگر صرف اتنا کہ دو وقت روکھی روٹی کھا سکے۔ زمیندار کے دستر خوان پر حلوا

پراٹھا۔ مرغ۔ کباب مکھن وغیرہ سب کچھ ہوگا۔ مگر غریب کسان پیاز یا نمک کے سہارے ٹکڑا حلق سے اتارے گا اور پیٹ کے دوزخ کو ٹھنڈا کرے گا۔ کپڑا لتا، موٹا جھوٹا اور رہنے کو وہی جھونپڑا جس میں جانور بندھتے ہیں۔ دنیا میں کیا ہورہا ہے اس غریب کو کچھ خبر نہیں۔ رات دن کی محنت سے اس غریب کو اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ وہ اپنے انجام کار اپنی عاقبت یا اپنے بچوں کے مستقبل کے متعلق غور کر سکے۔

وہ لوگ جو انسانیت اور انصاف کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھائے پھرتے ہیں ان سے پوچھنے کی بات ہے کہ کیا یہ انصاف ہے کہ کسانوں کی بے شمار مخلوق جو جان کھپا کر غلہ پیدا کرے۔ وہ خود جانوروں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو اور پیداوار کا مالک اسے مان لیا جائے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے اور جو غریب کسانوں کو غلام بنا کر رکھ سکتا ہے جو ان پر من مانا زور اور ظلم کر سکتا ہے۔

بہرحال اس دوسرے نظریہ کے ماننے والوں کا فیصلہ یہ تھا کہ پیداوار اس کی ہے جو اس کو پیدا کر رہا ہے یعنی کارخانہ کا مزدور یا کھیت کا کسان۔

اب رہا یہ سوال کہ مزدور اور کسان دونوں فاقہ مست ہیں۔ ان کے پاس دولت نہیں اور کارخانوں کے قائم کرنے اور زمینوں کے خریدنے کے لئے بے شمار روپیہ کی ضرورت ہے وہ کہاں سے آئے تو اس نظریہ کے ماننے والوں نے فیصلہ کیا کہ روپیہ لگانا اسٹیٹ اور سرکار کا کام ہوگا یعنی کارخانوں اور زمینوں کی مالک اسٹیٹ اور سرکار ہوگی۔

ایک تیسرا فریق جو ان دونوں نظریوں کا حامی نہیں ہے اس نے فوراً

اعتراض کیا کہ آپ کی اس تجویز کے مطابق مالک تو ضرور بدل گیا کہ زمیندار یا کارخانہ دار کے بجائے حکومت مالک بن گئی، مگر کاشتکار اور مزدور تو اب بھی مشین کے پرزے ہی رہے پیداوار کے مالک تو نہ ہوئے۔ پہلے وہ اپنی تمام ضرورتوں میں مالک کا منھ تکا کرتے تھے۔ اب اسٹیٹ کو دیکھا کریں گے۔ اتنا فرق تو ضرور ہوگا کہ پہلے ان کے رہنے سہنے۔ اوڑھنے پہننے۔ بیماروں کے علاج اور بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اب سرکار ان تمام ضرورتوں کا انتظام کرے گی مگر یہ خود اپنے اختیار میں اب بھی نہ ہوں گے۔

پہلے اس مشین کے پرزے تھے جس کو مالک یا زمیندار نے اپنی مصلحت کے مطابق تیار کی تھی۔ اب اس مشین کے پرزے ہو گئے جس کو اسٹیٹ کے لیڈروں نے تیار کیا ہے مگر آزاد زندگی نہ پہلے تھی نہ اب۔

دل و دماغ۔ ذہن اور انسانی صلاحیتیں جو آزادی میں نشو ونما پاتی ہیں وہ اگر زمینداروں اور مالکوں کی نادرشاہی میں مرجھائی ہوئی تھیں تو اب سرکار اور اسٹیٹ کے شکنجے میں کسی ہوئی ہیں۔ دودھ دینے والا جانور اپنے بچہ کو دیکھ کر دودھ دیتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنی چیز کے لئے سب کچھ کرتا ہے اور اپنی تمام صلاحیتیں عمل کے میدان میں لے آتا ہے۔ یہاں جب اپنی کچھ بھی نہیں ہر چیز اسٹیٹ کی ہے۔ مالک ہونے کا نام و نشان بھی ختم کر دیا۔ تو ظاہر ہے صلاحیتوں کے وہ جوہر بھی نہیں کھل سکتے جو مالک ہونے کی صورت میں نمایاں ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں نظریوں کے ماننے والوں میں اسی طرح کی بحث ہو رہی تھی کہ اسلام کے نمائندے سے کہا کہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں۔

بلاک نمبر ۲ کے نمائندے نے اول معذرت چاہی کہ شاید وہ ایسی بات کہے جس سے کسی کی بھی تائید نہ ہو اور ممکن ہے دونوں کو ناگوار گزرے۔

بلاک نمبر ۳ کے نمائندے نے کہا۔ جب ایسے بنیادی مسئلہ پر بحث ہو جو بے پناہ انقلاب کا دروازہ کھول سکتا ہے تو ضروری ہے کہ ہمارا دماغ ٹھنڈا ہو اور ہم مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غور کریں۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایک طبقہ کو سامنے رکھ کر غور کرتے ہیں۔ ہم اس طبقہ کی حرکتوں سے ناراض ہیں۔ پس ناراضی اور جذبۂ انتقام پہلے ہوتا ہے اور غور و فکر بعد میں۔ ایسی صورت میں یقیناً کوئی صحیح فیصلہ سامنے نہیں آسکتا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا دو بلاکوں میں بٹ گئی اور وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے جس کو رات دن اعلیٰ اخلاق اور بہتر کردار کی تعمیر میں مصروف رہنا چاہیئے اس کے سوچنے اور عمل کرنے کی تمام طاقتیں، دوسرے کو نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ اعلیٰ اخلاق اور بہتر کردار کے لئے کوشش تو درکنار اس کے تصور سے بھی دماغ خالی ہو گئے ہیں۔ اس کے بجائے ہر فریق کا دماغ اس میں مصروف ہے کہ دوسرے فریق کو کس طرح نیست و نابود کر دے۔

غور و فکر کی پہلی منزل

کہا جاتا ہے کہ امیر اپنے مال میں مست اور غریب کھال میں۔ یہ مقولہ صحیح مان لیا جائے تب بھی امیر جس کو اپنے مال پر ناز ہے اس کو سوچنا چاہیئے کہ یہ اس کا مال کہاں سے آیا ہے۔ کیا اس کی کوشش عقلمندی اور حسن تدبر کا نتیجہ ہے۔ یا کوئی اور طاقت ہے جو بڑے بڑے عقلمندوں کی تدبیر کو ناکام کر دیتی ہے۔ اس کی یہ مہربانی ہے کہ اس نے اس کی تدبیر ... کو

یہاں تک کامیاب کیا کہ مٹی پر ہاتھ ڈالا تو وہ بھی سونا بن گئی۔

اگر پردے کے پیچھے کوئی داتا ہے جس نے اس کے لئے مٹی کو بھی سونا بنا دیا تو انصاف یہ ہے کہ دولت مند (سرمایہ دار) اپنے اُس آقا اور داتا سے پوچھے، بُنکر نے اس کے کارخانہ میں کام کر کے جو تھان تیار کیا ہے وہ کس کا ہے وہ پورا میرا ہے یا اس میں کسی اور کا بھی حصہ ہے اگر ہے تو کتنا ہے۔

کسان اور مزدور بیشک اپنے حال میں مست ہیں ان کو اتنا مست تو نہ ہونا چاہیئے کہ اس کا بھی خیال نہ ہو کہ یہ بازو کہاں سے آئے اور ان کو یہ قوت کس نے بخشی کہ وہ یہ محنت کر سکے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مزدور کسان اور مالک کی یہ کش مکش صرف اس زمانہ میں پیدا ہوئی جس کو "مشینی دور" کہا جاتا ہے یہ صحیح نہیں ہے کش مکش کی صورتیں بدل گئیں۔ نعرے اور طریقے بدل گئے۔ مگر کش مکش آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے ہے جب تاریخ اس قابل بھی نہیں ہوئی تھی کہ قلم دوات سنبھال سکے[1]

بلاک ۳ کے نمائندہ نے کہا:-

قرآن حکیم کا اعلان ہے کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ " ہے (ہر مسئلہ کی وضاحت کرنے والا) اس کا نزول اگرچہ "مشینی دور" سے بھی تقریباً بارہ سو سال پہلے ہو چکا تھا مگر اس کا یہ اعجاز ہے کہ مشینی دور میں بھی وہ ہماری رہنمائی کر رہا ہے اس نے بہت سی مثالیں دے کر اس مسئلہ کے مختلف پہلو واضح کئے ہیں مثلاً

---

[1] یعنی جس زمانہ کو قبل از تاریخ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ جب محض سنی سنائی کہانیوں کو جو سینہ بسینہ محفوظ ہوا کرتی تھیں انھیں کو تاریخ کہا جاتا تھا۔

سورۂ نون میں چند باغبانوں کا قصہ بیان فرمایا ہے جب وہ باغ کا پھل توڑا کرتے تھے تو گاؤں کے بہت سے غریب اور فقیر وہاں پہنچ جایا کرتے تھے۔ عام رواج کے مطابق ان کو کچھ دینا پڑتا تھا۔ اس سال اُن باغبانوں کی طبیعت میں بخل آیا اور یہ طے کر لیا کہ دن نکلنے سے بہت پہلے شب کے آخری حصہ میں وہ باغ پہنچ جائیں اور تڑکے کے اندھیرے ہی میں تمام پھل توڑ کر گھر اٹھا لائیں۔ اس وقت نہ مانگنے والے موجود ہوں گے نہ ان کو کچھ دینا پڑے گا۔ یہ اُن کی تدبیر تھی۔ دوسری طرف قدرت کی پوشیدہ تدبیر نے یہ کیا کہ چوروں کی ایک ٹولی نے رات کے پہلے ہی حصہ میں باغ پر دھاوا بول دیا اور سارے پھل توڑ کر چلتی بنی۔ جب یہ مالک پھل توڑنے اور لادنے کا سارا سامان لے کر اپنے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ سارے پھل ٹوٹ چکے ہیں کسی پھل کا ایک دانہ بھی باقی نہیں رہا۔ پہلے ان کو خیال ہوا کہ شاید یہ باغ ہمارا نہیں ہے، غلطی سے دوسرے باغ میں آ گئے ہیں۔ مگر جب آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور پوری طرح پہچان لیا کہ ہمارا ہی باغ ہے تو اب عبرت کی آنکھیں کھلیں، اپنی غلطی محسوس ہوئی اور اپنے منصوبہ پر ماتم کرنے لگے۔ واقعی ہم ظالم ہیں بلکہ باغی اور سرکش ہیں۔ (سورہ نون پارہ ۲۹)

مختصر یہ کہ پیداوار کی تیاری صرف کسانوں کی محنت پر ہی نہیں ہے بلکہ محنت سے کہیں زیادہ قدرت کی وہ مدد ہے جو کسان کو محنت کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔ اس کے علاوہ ہوا، بارش، دھوپ اور اس طرح کی بے شمار نعمتیں جن کا خالق یہ کسان نہیں نہ اس میں طاقت ہے کہ ہوا اگر بند ہو جائے

تو اس کو پھیلا سکے۔ یا تیز ہوا کو ہلکا کر سکے یا باد سموم کی لپیٹ میں ٹھنڈک پیدا کر سکے۔ آخری چیز "حفاظت" ہے جو بظاہر کسان کے بس کی چیز ہے۔ مگر یہاں اس کی بے بسی بھی معلوم ہو گئی۔ انھیں خبر بھی نہیں ہوئی اور سارا باغ صاف ہو گیا۔ کسان سب کچھ کر سکتا ہے مگر "برق خرمن سوز" سے کھلیان کو نہیں بچا سکتا۔

سورۂ کہف کے چوتھے رکوع میں ایک زمیندار کا قصہ بیان فرمایا ہے اعلیٰ قسم کے بہترین درختوں اور پھلوں کے دو باغ اس کے پاس تھے جو نہروں کی روانی سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتے تھے۔ پیداوار کی بہتات اور پھلوں کی غیر معمولی کثرت نے اسے آپے سے باہر کر دیا۔ اونچے درجے کے زمینداروں اور تعلقہ داروں سے اس کے تعلقات ہو گئے۔ اب وہ اپنے حقیقی بھائیوں اور ان ساتھیوں کو بھی حقارت سے دیکھنے لگا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے اُس کے دماغ میں یہ سما گیا کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ میرے پاس دولت بھی زیادہ اور میرے دوست احباب بھی وہ ہیں جو چوٹی کے آدمی مانے جاتے ہیں اس کا تصور بھی اس کے دماغ سے نکل گیا کہ قدرت کا جھٹکا آناً فاناً انقلاب پیدا کر سکتا ہے پُرانے ساتھیوں نے اس کو سمجھایا بھی کہ اس ٹیپ ٹاپ اور ظاہری شان و شوکت پر مت اتراؤ۔ اپنی حقیقت پر نظر رکھو کہ وہ مٹی ہے یا گندے پانی کا قطرہ، پس جو کچھ ہے پروردگار کا انعام ہے۔ اس نے تمھیں انسان بنایا۔ اسی نے یہ دولت و عظمت بخشی۔ تمھیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے مگر اس کی نظر اسی ٹیپ ٹاپ اور شان و شوکت پر تھی وہ ان کی بات کب سُن سکتا تھا جو اس کی نظر میں ذلیل اور حقیر ہو چکے تھے؟ وہ ان انسانوں کو بھی انسان نہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگا تھا

جو اس کی زمینیں جوتتے تھے۔ وہ اُن سے لگان وصول کرنے کے لئے یہاں تک تیار رہتا تھا کہ درخت پر اُلٹا لٹکا دے یا ہاتھ پیر باندھ کر تپتی ریت پر ڈال دے۔ وہ ان غریبوں کو جنھوں نے اس کی زمین پر جھونپڑیاں ڈال لی تھیں اپنا زر خرید غلام سمجھتا تھا۔ جب چاہتا ان کو بیگار میں پکڑ لیتا تھا۔

دفعتہً حالت بدلی ہوا اور بارش کے طوفان نے اُس کے تمام باغ اجاڑ دیئے یقیناً آندھی سے غریبوں کی جھونپڑیاں بھی اُڑ گئی ہوں گی مگر اس گھمنڈی زمیندار کا تو یہ حال ہوا کہ انگوروں کی تمام ٹٹیاں گر گئیں۔ درخت اکھڑ گئے باغ اجڑ گیا اور یہ دیوالیہ بن کر رہ گیا۔ اب وہ پچھتا رہا تھا مگر پچھتانا بے کار تھا۔

قرآن حکیم میں چند جگہ اُن تاجروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک روپیہ کے دو اور دو کے چار بنالیں۔ خواہ وہ کم تولیں۔ ڈنڈی ماریں یا لوگوں کی ضرورت اور حاجت سے فائدہ اٹھا کر ایک پیسے کی چیز کے دس پیسے وصول کریں۔ یا احتکار[1] اور اکتناز[2] جیسی حرکتوں سے پورے ملک میں اقتصادی بحران پیدا کر دیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو سمجھانا چاہا تو ان کا برملا جواب یہ تھا۔

کیا تمھاری نماز تمھیں ہدایت کرتی ہے کہ ہم اپنے مال میں اپنی رائے سے کام نہ کر سکیں۔ (سورہ ہود ع ۸)

بلاک نمبر۳ کے نمائندے نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

قارون کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا دولت مند اور

---

[1] احتکار ضرورت کی چیز کو روک کر دگنی چوگنی قیمت پر بیچنا یعنی بلیک کرنا۔

[2] اکتناز۔ ذخیرہ کرنا۔ جوڑنا۔

سرمایہ دار تھا کسی بڑے سے بڑے بینک کے بھی اتنے تالے نہیں ہوتے جتنے تالے اس کی تجوریوں کو لگے رہا کرتے تھے کہ ان سب کی تالیاں اگر یک جا کر لی جائیں تو ایک دو آدمی تو درکنار نوجوانوں کا ایک دستہ بھی ان کو اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتا تھا۔

اس کو گھمنڈ تھا کہ کاروبار کی خاص سمجھ بوجھ جو اس کا طرۂ امتیاز ہے، اس کی ترقی کا راز ہے اور بے شمار دولت اسی کے سبب سے حاصل ہوئی ہے اس کو بتایا گیا کہ بہت سے وہ ہیں جو سمجھ بوجھ میں تم سے زیادہ ہیں مگر وہ سرمایہ دار تو کیا ہوتے، نان شبینہ کو بھی محتاج ہیں۔ لہٰذا تمھارے اندر سمجھ بوجھ کا پیدا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے۔ پھر تدبیروں کو توقع سے زیادہ کامیاب کردینا بھی اسی کا احسان ہے پس جس طرح اللہ تعالےٰ نے تم پر احسان کیا ہے۔ تم بھی خلق خدا پر احسان کرو مگر اس کو قارون ہی کیوں کہا جاتا۔ اگر یہ سچی نصیحت پر عمل کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے بجائے خود اپنے ہنر اور سلیقہ اور اپنی کاروباری تدبیروں پر اس کو اعتماد بڑھتا رہا وہ غریبوں پر احسان تو کیا کرتا غریبوں کی مزدوری میں سے بھی کٹوتی کرنے لگا۔ مزدوروں کی مجبوری اور غربت سے فائدہ اٹھا کر ان کو مزدوری کم دیتا اور کام زیادہ لیتا تھا۔ ہر ایک طبقہ اس کی سرمایہ داری اور اس کے سرمایہ دارانہ طرز و طریق سے متاثر ہوا مگر جب ایسا ہو گیا کہ وہ پوری بلڈنگ جس میں یہ خزانے تھے زمین میں دھنس گئی۔ تب لوگوں کو احساس ہوا کہ محض سلیقہ مندی اور کاروباری ذہنیت اور تجربہ ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے جس پر ترقی کا مدار ہے اور کوئی اور بھی ہے جس کے بغیر ترقی کا باقی رہنا ناممکن ہے یعنی زمین اور آسمان کے سیکڑوں حوادث اور آفات سے محفوظ رہنا جو انسان کے بس کی چیز نہیں ہے وہ صرف اس کے بس کی چیز ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ جو

ان حوادث کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔

بلاک ۳ کے ترجمان نے کہا۔ قرآن پاک کی یہ چند مثالیں ہر سمجھ دار کو آگاہ کر رہی ہیں کہ مالک ہونے کی جو دلیل بھی پیش کی جائے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی مالک نہ مزدور ہے نہ سرمایہ دار۔ مالک دراصل کوئی اور ہے اور یہ دونوں نمائشی تصویریں اور دکھاوے کی مورتیاں ہیں اور بس۔!

اگر سرمایہ دار کا یہ تصور ہے کہ پیداوار اس کی ہے جس کا سرمایہ ہے تو اسی دلیل کا تقاضا ہے کہ مالک حقیقی وہ ہو جس نے سرمایہ دار کو سرمایہ بخشا، جس نے سرمایہ دار کی تدبیروں کو کامیاب بنایا۔ جس نے اس کو یہ خوش نصیبی عطا کی کہ مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ بھی سونا بن گئی۔ بادل برستا ہے ٹیلے خشک رہ جاتے ہیں اور گڑھے تالاب بن جاتے ہیں۔ بیشک کہا یہی جاتا ہے کہ پانی تالاب کا ہے مگر کیا تالاب کے لئے درست ہے کہ وہ ابرِ رحمت کو بھول جائے اور کیا کسی حقیقت پسند کے لئے درست ہے کہ تالاب کے پانی کو بادلوں کا طفیل نہ سمجھے۔

اگر مزدور کی یہ دلیل ہے کہ اس کی محنت سے کپاس۔ روئی۔ روئی کا گالا اور سوت بنا۔ پھر اس کی محنت سے سوت نے کپڑے کی یہ صورت اختیار کی۔ اس لئے اس کپڑے کا اصل مالک مزدور ہے تو کیا اس دلیل کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اصل مالک وہ ہو جس نے اس کو محنت کرنے کی طاقت بخشی جس نے اس کو ہاتھ پاؤں اور وہ بازو دیئے جن سے یہ محنت کر سکا۔ جس نے اس کو بینائی بخشی۔ تندرستی عطا کی۔

مشینوں کے فولادی پرزے اپنی جگہ جامد ہیں۔ ان میں کوئی حرکت نہیں۔ قمقمے کانچ کے کھلونے ہیں۔ ان میں کوئی روشنی نہیں۔ برقی پنکھوں کی پنکھڑیاں

لوہے یا ٹین کے ٹکڑے ہیں۔ ان میں ہوا کا نام نہیں۔ بجلی کا کرنٹ دوڑا۔ اس نے مشین کو متحرک کر دیا۔ ہر ایک پرزہ تیزی سے کام کرنے لگا۔ قمقمے روشن ہو گئے، پنکھے ہوا پھینکنے لگے۔ اب بتاؤ کیا مشین کے پرزوں کو حق ہے کہ وہ اس کرنٹ کو بھول جائیں جس نے اسے متحرک بنایا۔ قمقمہ اگر اپنا ہی ترانہ گا رہا ہے، تو یہ اس کی حماقت ہے۔ بجلی کے پنکھے کو کیا حق ہے کہ وہ ہوا کو صرف اپنی عطا سمجھے۔ ہوا تو یہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے اس کو حرکت دے دی اور جو کچھ حرکت دی بجلی کی طاقت سے نہ اپنی ناچیز ہستی سے۔

غور و فکر کی دوسری منزل

بلاک ۳۲ کے نمائندے نے کہا کہ غور و فکر کی پہلی منزل یہ تھی کہ ہم سوچیں کہ سرمایہ یا محنت کا مبدا اور حقیقی سرچشمہ کیا ہے۔ اس کے سوت ہماری ذات سے ہی پھوٹتے ہیں یا سرچشمہ کوئی اور ہے جہاں سے یہ سوت بہہ کر آتے ہیں۔ دوسری منزل غور و فکر کی یہ ہے کہ ہم مآل اور انجام پر نظر ڈالیں۔ ہم، ہماری حقیقت اور ہماری نسبتیں صرف اسی حد تک ہیں جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ یا کوئی سلسلہ مرنے کے بعد بھی باقی رہنے والا ہے۔

آج دنیا علم و فن کے ترانے گا رہی ہے۔ ترقی کے بلند بانگ دعوے ہیں تحقیقات کی مشینوں سے بال کی کھال کھینچی جا رہی ہے۔ مگر یہ صرف ان چیزوں کے بارے میں ہے جس کا تعلق اس وقفہ سے ہے جس کو "زندگی" کہتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس طرف ہماری تحقیقات کی باگیں نہیں مڑتیں۔ ہم نے اس سے آنکھیں قطعاً بند کر رکھی ہیں۔

ایک عجیب بات ہے جس طرح ہر انسان کو یقین ہے کہ وہ ہمیشہ نہیں رہے گا اسی طرح ہر سمجھ دار انسان کو اس کا بھی یقین ہے کہ وہ نہ رہنے کی صورت میں بھی کچھ رہے۔ یعنی ہر سمجھ دار یہ سمجھتا ہے کہ "مرنا" نیست و نابود اور پوری طرح فنا ہونا نہیں ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ایک سلسلہ ہے جو باقی رہے گا اور ہمارے آج کے اچھے بُرے عمل کا اثر اس سلسلہ پر پڑے گا۔ جو سمجھ دار زیادہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں انھیں اس کا بھی یقین رہتا ہے کہ ہمارا ہر ایک عمل ایک بیج ہے اور ہماری پوری زندگی ایک کھیتی ہے جو بوئی جا رہی ہے۔

ہم نے دن بھر کام کیا۔ شام کو مزدوری مل گئی۔ گویا بیج بویا جس کا پھل ہاتھ در ہاتھ مل گیا۔ کاشتکار نے آج گیہوں کا دانہ ڈالا۔ اُس کا پھل چھ ماہ بعد اس کو ملے گا۔ اور اگر اُس نے آم کی گٹھلی بوئی تھی تو اس کا پھل اس کو دس بارہ سال بعد نصیب ہوگا۔ کھجور کے درخت کا پھل چالیس پچاس سال بعد آتا ہے اور کچھ بیج ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ مدت میں اُگتے اور پھلتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے بہت سے عمل ہیں جن کے پھل اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے۔

وہ بنیادی مسئلے جن کو قرآن پاک کا موضوع کہنا چاہئے۔ ان میں سے انسانی زندگی کا مسئلہ بھی ہے۔ قرآن حکیم اصل زندگی اسی کو قرار دیتا جو بعد الموت ہوگی۔ اس کے نزدیک موجودہ زندگی ایک تمہید ہے یعنی ایک ایسا وقفہ ہے جس میں وہ بیج بو رہا ہے۔ بہت کم بیج وہ ہیں جن کا پھل اسی وقفہ میں مل جاتا ہے اور زیادہ تر بلکہ تمام تر بیج وہ ہیں جو اس وقفہ کے گزرنے کے بعد پھل لاتے ہیں

بلاک ۳ کے نمائندہ محترم نے کہا کہ ہماری بہت بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ہم حال اور مستقبل کی طرف توجہ نہیں کرتے اور باوجودیکہ ہمیں یقین رہتا ہے کہ عمل اور پاداش عمل کا سلسلہ موت پر ختم نہیں ہوگا۔ بلکہ مرنے کے وقت اس کا آغاز ہوگا۔ ہمارے عمل اس یقین کے اثر سے محروم اور قطعاً ناآشنا رہتے ہیں۔ ہم اگر سرمایہ دار ہیں تو ہمارا نصب العین صرف یہ ہے کہ جس طرح ہو روپیہ ملے۔ بسا اوقات آخرت کا لفظ زبان پر آتا ہے مگر دل پر اس کا اثر بالکل نہیں ہوتا۔

ہم بھوکوں کو دیکھتے ہیں ضرورت مند ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہئے۔ مگر ہم مدد کرنے کے بجائے ان کی ضروریات اور ان کی مجبوری اور لاچاری سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ وہ کم سے کم مزدوری پر راضی ہوجائے اور ہمارا کام زیادہ سے زیادہ کرے۔

وہ غریب جو فاقہ سے نڈھال ہے جس کے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں، پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کے لئے اسی کو غنیمت سمجھتا ہے کہ کسی طرح کچھ پیسے اس کے ہاتھ لگیں جن سے وہ اپنے اور اپنے بچوں کے حلق میں دانہ ڈال سکے۔

کوئی پریشان حال قرض لینا چاہتا ہے تو ہم سود کی شرط لگاکر اس کی پریشانی اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر اگر وہ وقت پر ادا نہیں کر سکتا تو ہم دوسرا نفع یہ کماتے ہیں کہ اس کے برتن اور کپڑے تک کم قیمت پر نیلام کرا لیتے ہیں۔

ایک مزدور جو اسی وقفہ کو کل ہستی سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے حلال حرام جائز۔ ناجائز کا سوال ختم ہوجاتا ہے۔ اس زندگی کے ٹھاٹ کے لئے اسے

رشوت، خیانت، غبن وغیرہ سے شرم نہیں آتی۔ اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے وہ دولت مند کو نشانہ بناتا ہے اور اگر موقع مل جائے تو اسے لوٹ کھسوٹ کر برباد کردینے کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہے۔

ان تمام بیماریوں اور ہولناک خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ:

(۱) انسان اپنی حقیقت پر نظر رکھے کہ غریب سے غریب اور لاچار و مجبور انسانوں کی طرح اس کی پیدائش بھی حقیر اور ذلیل چیز سے ہوئی ہے۔

(۲) دولت و ثروت۔ ہنر۔ سلیقہ۔ تدبیر یا محنت و مزدوری کی طاقت جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ اس کی اپنی بنائی ہوئی اور اپنی پیدا کی ہوئی نہیں ہے بلکہ عطا کی ہوئی ہے اور اسی طرح بخشی ہوئی ہے جیسے تالاب کو پانی اور قمقمہ کو بجلی کی روشنی۔

(۳) ہم مالک نہیں ہیں۔ مالک اللہ ہے جو ہمارا بھی خالق ہے اور ان تمام وسیلوں اور ذریعوں کا بھی خالق ہے جن سے ہم کام نکالتے ہیں۔

(۴) کاروباری زبان میں ہمیں بھی مالک کہا جاتا ہے۔ مگر ہماری ملکیت تنہا ہماری نہیں ہے بلکہ اس میں اس کا بھی حصّہ ہے جو مالک حقیقی ہے۔

(۵) اس حصہ کی ادائیگی ضرورت مندوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ پس ان ضرورت مندوں۔ بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کا بھی ہمارے مال میں حصّہ ہے۔ اگر ہم اس کو ادا نہ کریں تو ہم غاصب، خائن اور مجرم ہیں کہ دوسرے کی چیز میں دست درازی کر رہے ہیں۔

(۶) قطعاً ناجائز ہے کہ کمزور کی کمزوری یا ضرورت مند کی ضرورت سے

فائدہ اٹھائیں۔اسی بنا پر بیگار لینا حرام ہے۔

(۷) مزدوری یا تنخواہ کی ایسی شرح ضروری ہے جس سے ملازم اور مزدور مطمئن ہوں اور بہتر یہ ہے کہ شرح اجرت ایسی ہو جس سے آپ کی فراخ حوصلگی اور سیر چشمی ظاہر ہو۔

(۸) تجارت کے سلسلے میں احتکار اور اکتناز ممنوع اور ملعون ہے۔

سود لینا گویا رب العالمین کے مقابلہ میں علم بغاوت بلند کر دینا ہے۔

قارون کو (جو سرمایہ دار کی ایک مثال ہے) چار باتوں کی ہدایت کی گئی تھی اور یہی چار[1] باتیں وہ ہیں جو سرمایہ دار کی خصوصیات ہیں۔

(۱) لاتفرح۔ اِترامت۔یعنی اپنے آپے سے باہر مت ہو کہ اپنے جیسے انسانوں کو حقیر سمجھے اور جانوروں کی طرح ان سے کام لے۔

(۲) اپنی نظر دنیاوی زندگی کی حد تک محدود نہ رکھ بلکہ آخرت کا سامان بھی کر۔

(۳) یہ کبھی بھی فراموش نہ کرو کہ تم بھی سب انسانوں کی طرح ایک انسان ہو۔ پس اس دنیا میں تمھارا حصہ یہی ہونا چاہیئے جو کسی بھی انسان کا ہو سکتا ہے۔ اس عام حصہ سے زیادہ جو کچھ تمھیں ملا ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور اس کا مخصوص احسان ہے۔

(۴) جس طرح اللہ نے تم پر احسان فرمایا ہے تم بھی خلق خدا پر احسان کرو۔

---

[1] یعنی اترانا۔ دنیا میں پھنس[2] جانا۔ ایک[3] انسان کی حیثیت سے جو حقیقت ہے اس کو فراموش کر دینا۔ اللہ تعالیٰ کے احسان کو بھول جانا۔

سوال و جواب

بلاک ۳ کا نمائندہ ملکیت کے مسئلہ پر اپنی تقریر ختم کر چکا تو حاضرین نے بہت سے سوالات کئے۔ نمائندہ محترم نے ان کے نہایت مدلل اور تسکین بخش جواب دیئے۔ ان سب کو لکھا جائے تو بہت بڑی کتاب بن جائے گی۔ یہاں ہم چند سوال اور ان کے جوابات جو نہایت ضروری اور مفید ہیں درج کرتے ہیں۔

سوال: آپ مالک حقیقی اللہ تعالیٰ کو قرار دیں یا آپ یہ فرمائیں کہ سرمایہ دار پر فرض ہے کہ وہ تسلیم کرتا رہے کہ نفع اور آمدنی میں اللہ تعالیٰ کا بھی حصہ ہے۔ یہ تھوڑا سا فرق سہی۔ مگر بہر حال آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قانون کی رو سے مالک سرمایہ دار ہوتا ہے اور پیداوار اس کی ہوتی ہے جس کا سرمایہ ہے یعنی آپ فرد کی ملکیت تسلیم کرتے ہیں۔

جواب: جناب والا۔ فرد کی ملکیت تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مزدوری یا تنخواہ جو کسی مزدور یا کلرک کو ملتی ہے۔ وہ برتن جو اس کے مکان میں ہیں، وہ کپڑے جو وہ پہنے ہوئے ہے کیا یہ اس کی ملک نہیں ہیں۔ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان پھٹکر چیزوں کا مالک وہ فرد ہی ہے۔ سوال اس طرح کی ملکیت کا نہیں ہے بلکہ سوال ہے پیداوار اور ذرائع پیداوار کی ملکیت کا۔ مثلاً زمین اور اس کی پیداوار۔ بڑے بڑے کارخانے اور ان کی پیداوار۔ آپ کہتے

ہیں کہ فرد ان کا مالک نہیں ہوسکتا اور اسلامی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ فرد ان کا مالک ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مالک ہوا ہی کرے یعنی مسلم قیادت جس کو اصطلاح میں "اولی الامر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ملک و ملت اور مفاد عوام کا لحاظ کرتے ہوئے طے کردے کہ فلاں قسم کے کارخانے یا فلاں علاقے یا پورے ملک کی زمین افراد کی نہیں ہوگی "حکومت" کی ہوگی۔ تو اس کو جائز مانا جائے گا۔ یعنی اسلام جس طرح فرد کی ملکیت تسلیم کرتا ہے اسی طرح اس نے مسلم قیادت کو یہ حق بھی دیا ہے کہ اگر مفاد عوام کے پیش نظر ضرورت سمجھے تو وہ ملکیت پر پابندی لگادے۔

بلاک ۳ کے نمائندے نے تقریر کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا اسلامی قانون کا یہ اصول یاد رکھیئے کہ عوام کے مفاد کو خواص کے فائدے پر مقدم رکھا جائے گا۔ یعنی اگر ایک دولت مند جنگل کا پورا رقبہ اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے سیکڑوں ہزاروں مویشی پرورش پاسکیں اور اس کے برخلاف اس علاقہ کے عوام کی شکایت ہے کہ اگر یہ رقبہ اس دولت مند کے قبضہ میں چلا گیا تو ہمارے مویشی چراگاہ سے محروم ہوجائیں گے تو اس صورت میں دولت مند کو اجازت نہیں دی جائے گی اور عوام کے مفاد کو اس خاص دولت مند کے مقابلہ میں مقدم رکھا جائے گا[1]

اس کے بعد نمائندہ محترم نے سنجیدگی سے فرمایا۔ بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ بھوکوں اور ننگوں کے نام پر سرمایہ داری کے خلاف شور مچاکر جو نسخہ تجویز کیا

---

[1] کتاب الخراج علامہ ابی یوسف و یحیی بن آدم و الاشباہ والنظائر وغیرہ۔

کیا جاتا ہے۔ اس سے اصل مرض ختم نہیں ہوتا اور عجیب بات یہ ہے کہ کچھ نئے مرض پیدا ہو جاتے ہیں۔

غور فرمائیے طے یہ کیا گیا کہ فرد کی ملکیت ختم کر کے تمام پیداوار اور ذرائع پیداوار حکومت (اسٹیٹ) کے مان لئے جائیں اور ان کو پوری قوم کی ملک تصور کر لیا جائے۔ تاکہ غریبی اور بے روزگاری ختم ہو۔ بیشک اس طرح فرد کی ملکیت ختم ہو گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا پورے ملک سے غریبی بھی جاتی رہی، کیا بیروزگاری ختم ہو گئی۔ کوئی کارخانہ کسی فرد کی ملکیت ہو یا اسٹیٹ کی۔ اس میں کام تو اتنے ہی آدمی کریں گے جتنوں کی کھپت ہو گی۔ باقی لوگ تو پھر بھی بے روزگار ہی رہیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد جبر و قہر کر کے پچاس کا کام چالیس آدمیوں سے لیتا تھا۔ حکومت نے جبر و قہر سے کام نہیں لیا۔ پچاس کی جگہ اور مان لیجئے کچھ بڑھا کر ساٹھ کو کام پر لگا دیا مگر باقی چالیس تو پھر بھی بیکار رہے۔ ان کے علاوہ یتیم بچوں، بیواؤں، اندھے، لولے، محتاجوں کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ وہ ویسے ہی بھوکے ننگے رہے۔ یعنی اصل مرض باقی رہ گیا۔

نئے مرض یہ پیدا ہوئے کہ آپس میں نفرت، دشمنی اور بغض بڑھ گیا۔ ایک دوسرے کی ہمدردی ختم ہو گئی۔ کیونکہ سرمایہ دار کو ان چالیس بے روزگاروں سے قدرتی طور پر نفرت ہے کہ اس کے نام پر اس کا کارخانہ ضبط کیا گیا اور یہ ساٹھ آدمی جن کو کارخانہ میں روزگار ملا وہ خود اپنے آپ کو ضرورت مند سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنی ضرورت پوری کرنی ہے۔ اپنی زندگی بنانی ہے۔ انھیں اس کا احساس ہی نہیں کہ ہماری تعداد کے لگ بھگ وہ بھی ہیں جو ایک ایک

دانہ کو محتاج ہیں۔ اور ہمارا ابھی فرض ہے کہ ہم ان کی امداد کریں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں
کہ اگر یہ ننگے بھوکے ہیں تو سرکار کا فرض ہے کہ ان کو کھانا کھلائے۔ ہمارا
فرض صرف یہ ہے کہ سرکار کی کچھ خرابیاں نکال دیں۔ وزیروں کو برا بھلا کہدیں
اس طرح خود غرضی اور آپس کی مخالفت، بے اطمینانی اور بے اعتمادی جیسے
نئے مرض پیدا ہوگئے۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی، ہمدردی اور محبت جیسے
جوہر فنا ہوگئے۔ لیکن اسلام نے فرد کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے جب ہر فرد
پر لازم کر دیا کہ اپنی ملک میں اللہ تعالٰے کا حصہ ضروری قرار دے۔ خصوصاً ہر
دولت مند پر لازم قرار دیا کہ وہ سالانہ بچت کا چالیسواں حصہ ضرورت مندوں کو
ادا کرے۔ اور دولت مند ہر اس شخص کو قرار دیا جس کے پاس سال بھر میں ساڑھے
باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت پس انداز ہو جائے تو اس طرح قدرتی طور پر ان چالیس
بے روزگاروں کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

یہاں بے روزگاروں اور غریبوں کو دولت مندوں سے نفرت نہیں
ہو سکتی۔ کیونکہ دولت مند ان کا محسن ہے۔ اپنی بچت کا چالیسواں حصہ ان کو دے
رہا ہے۔ دولت مند کو بھی ان غریبوں سے نفرت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان غریبوں کی
وجہ سے اس کی کوئی چیز ضبط نہیں ہوئی اور جو کچھ اس نے دیا ہے وہ ہمدردی کی
بنا پر اپنی خوشی سے اپنے لئے ثواب اور ذخیرہ آخرت سمجھ کر دیا ہے۔

اسلام کہتا ہے دولت کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ اس کے باوجود دولتمند
پر جبر و قہر نہیں کرتا بلکہ اس کو انسانیت کا سبق یاد دلاتا ہے۔ اس کے اندر
انسانی بھائی چارہ کا جذبہ ابھارتا ہے۔ وہ دولت مند کو سمجھاتا ہے کہ انسان

وہ ہے جو غریبوں کا ہمدرد ہو بے بسوں اور لاچاروں کا مددگار ہو۔

بھائی چارہ، ہمدردی اور غمخواری کا یہ سبق صرف بڑے دولت مندوں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اسلام یہ سبق ان سب کو دیتا ہے جو نصاب کے مالک ہوں۔ اس طرح وہ بڑے بڑے پونجی پتیوں سے لے کر معمولی درجہ کے تاجر، دوکان دار، کارخانہ دار، ملازم یا مزدور (جو سال بھر میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے روپے پس انداز کرے) ان سب کو غریبوں اور ضرورتمندوں کی امداد کے لئے متحد کر دیتا ہے یعنی امداد غربا کی ایسی انجمن بنا تا ہے جس کا ممبر ہر وہ مسلمان ہوتا ہے جو اتنی فراغت رکھتا ہو کہ سال بھر میں اتنی چاندی یا اس کی قیمت بچالے۔ پھر ہر ممبر پر لازم قرار دیتا ہے کہ:۔

(۱) سال ختم ہونے پر سرمایہ اور بچت کا چالیسواں حصّہ خود یا اسلامی حکومت کے ذریعہ ضرورت مندوں کو ادا کرکے ان کی ضرورتیں پوری کرے۔

(۲) تیوہار کے موقع پر خاص مقدار میں غریبوں کی امداد کرے یعنی عید الفطر کے موقع پر صدقۃ الفطر ادا کرے اور عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرکے جس کی کھال قومی ضرورتوں کے لئے دے دی جائے اور گوشت میں سے ایک حصّہ ضرورت مند فقیروں اور مسکینوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

ایک بڑی تعداد ان کی ہوگی جو اپنی آمدنی میں سے اپنی ضروریات تو پوری کر لیتے ہیں مگر کچھ بچا نہیں سکتے۔ راہِ خدا میں ان کو بھی خرچ کرنا چاہئے۔ ان کیلئے کوئی مقدار معین نہیں۔ ان کیلئے صرف یہ حکم ہے کہ جو اپنی ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ واسطے دے دیں[1]

---

[1] قال اللہ تعالےٰ: یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو (سورہ بقرہ)

اسلام فرد کی ملکیت ختم نہیں کرتا بلکہ اچھی اور بری ملکیت میں فرق پیدا کرتا ہے پھر بری ملکیت کو مٹاتا ہے اور اچھی ملکیت کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے۔

سب سے بری ملکیت اسلام میں وہ ہے جو عوام کو نقصان پہنچا کر دولت کو چند افراد میں سمیٹ دے۔ اسلام ایسی ملکیت کو حرام قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سود خواروں سے اسلام نے مستقل طور پر اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ سٹے، جوئے اور اس طرح کے تمام کاموں کی سختی سے ممانعت کی ہے اور جو خود غرض، عوام کی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر ضرورت کی چیزیں زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کریں۔ ان کو محتکر[1] کہا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لعنت بھیجی ہے[2]۔ جو رقم ان ذرائع سے کسی کے پاس پہنچے اسلامی حکومت کا فرض ہو گا کہ وہ واپس کرلے اور اگر کوئی واپس لینے والا نہ ہو تو ضرورت مندوں کو تقسیم کرا دے۔

اسلام کہتا ہے سخاوت، بخشش، ایثار (یعنی اپنی ضرورت پیچھے ڈال کر دوسرے کی ضرورت پوری کرنا) کسی پر احسان کر کے احسان نہ جتانا۔ اس قسم کے اوصاف انسانیت کے قابل فخر اوصاف ہیں۔ ان کا ظہور اسی وقت ہو سکتا ہے جب فرد کے لئے ملکیت تسلیم کی جائے۔ ملکیت نہ ہو تو انسانیت کے یہ جوہر بھی ظہور میں نہیں آئیں گے۔

---

[1] محتکر احتکار سے ماخوذ ہے اور ضرورت کے وقت کسی سودے کو روک لینا کہ زیادہ نفع پر بیچا جاسکے "احتکار" کہلاتا ہے۔

[2] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحتکر ملعون

اسلام ایک عجیب و غریب فلسفہ ذہنوں میں اتارتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دولت کی بڑھوتی اس میں ہے کہ وہ راہ خدا میں خرچ ہوتی رہے۔ آب رواں صاف وشفاف اسی وقت ہوتا ہے جب بہتا رہے۔ کسی گڑھے میں رک جائے تو تھوڑے دنوں بعد گدلا اور بدبودار ہوجاتا ہے۔ اس کنویں کا پانی سب سے زیادہ صاف ہوتا ہے جس سے باغوں اور کھیتوں کو سینچا جاتا رہے۔ وہ پورا کنواں بدبودار ہوجاتا ہے جس سے پانی نہ سینچا جائے۔

قدرت کی فیاضیوں نے ہر قدرتی چیز کو ایسا ہی بنایا ہے۔ ہوا کسی جگہ رک جائے تو خراب ہوجاتی ہے۔ اس کمرے میں ہوا زیادہ آتی ہے جہاں نکلنے کا راستہ بھی فراخ ہو۔ کھلے میدان کی دھوپ جو تاثیر رکھتی ہے اگر کسی گھیرے میں آجائے تو اُس کی وہ تاثیر نہیں رہتی۔

سود خوار سمجھتے ہیں کہ دولت سود سے بڑھتی ہے۔ اسلام کہتا ہے سود کی دولت بند کنویں کا پانی ہے جو فضا کو مسموم اور صحت کو تباہ کردیتا ہے اور خود دولت مند کو ایسا کردیتا ہے جیسے کوئی مالیخولیا کا مریض ہو[1]۔ وہ رات دن ننانوے کے پھیر میں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سود کی محبت میں اپنے عزیزوں سے بھی اس کو نفرت ہونے لگتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ سود کے جنون میں اپنا کھانا پینا بھی تج دیتا ہے

---

[1] الذین یاکلون الربٰوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطٰن من المس الخ (سورہ بقرہ)

دولت مند سمجھتا ہے کہ محفوظ وہ ہے جو اس کی تجوری میں ہے۔ اسلام کہتا ہے یہ محفوظ نہیں ہے۔ یہ تو چوری ہو سکتا ہے۔ اس پر ڈاکہ بھی پڑ سکتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قارون کے خزانہ کی طرح زمین میں دھنس جائے اور اگر تم کسی بینک میں محفوظ کرا دو تب بھی محفوظ نہیں ہے۔ کیونکہ آئے دن بڑے بڑے بینک "دیوالیہ" ہوتے رہتے ہیں۔

اسلام کہتا ہے محفوظ وہ ہے جو راہ خدا میں خرچ کر ڈالو، کیونکہ یہ زندگی اصل زندگی نہیں۔ یہ تو ایک وقفہ ہے جیسے کوئی مسافر کہیں ٹھیر جاتا ہے۔ اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد یعنی اس عالم سے انتقال کے بعد ہوگی۔ اس وقفہ میں جو کچھ تم کرو گے اس کا پھل اصلی زندگی میں (مرنے کے بعد) پاؤ گے۔

اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ راہِ خدا میں خرچ کر رہے ہو وہ ایک دانہ ہے جس کو تم بو رہے ہو۔ گیہوں کا دانہ جو زمین میں بویا گیا۔ تم سمجھتے ہو اس کو مٹی میں ملا دیا گیا۔ تمھارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ مگر وہ دانہ اُگتا ہے اس کی نال نکلتی ہے، پھر اس میں خوشے لگتے ہیں۔ اگر ایک نال پر سات بالیں لگیں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوں تو ایک دانے کے سات سو دانے ہو گئے اور اگر زمین زور دار ہے پانی طاقتور ملا۔ ہوا اور دھوپ بھی اچھی لگتی رہی تو سات کے بجائے دس بالیں یا اس سے زیادہ بھی آسکتی ہیں اور ایک بال میں سو سے زیادہ دانے بھی ہو سکتے ہیں [۵]

---

[۵] خالص اللہ کے لئے خرچ کیا جائے۔ نام نمود، کسی پر احسان رکھنا مد نظر نہ ہو۔ پھر راہ خدا میں خرچ کرنے کے ساتھ اور نیک کام بھی ہوتے رہیں۔ ان چیزوں سے (باقی بر صفحہ آئندہ)

ایک دولت مند کو زعم ہوتا ہے اپنی دولت پر۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کھالیا وہ خرچ ہوا۔ جو پہن لیا وہ گھس کر پرانا ہو گیا۔ جو بچا وہ وارثوں کا ہیں محفوظ اور ترقی پذیر وہ ہے جو راہ خدا میں خرچ ہوا۔

یہ ہیں وہ تعلیمات جن پر اسلام اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ ان تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفع اندوزی اور غریبوں یا کمزوروں کا خون چوسنے کے بجائے ایک ایسا سماج ظہور میں آتا ہے جس کا نصب العین ہوتا ہے کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کرنا۔ ان کی پستی کو دور کر کے ایک مساوی سطح پر ان کو ہموار کرنا۔ ایک دوسرے کی ہمدردی اور آپس میں بھائی چارہ قائم کرنا۔ اور اس طرح ایک ایسی زندگی پیدا کرنا جس کو قرآن حکیم "حیات طیبہ" کہتا ہے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نیکی کے دانہ میں قوت آتی ہے۔ دینی ضرورت گویا زمین ہے جتنی زیادہ ہوگی یہ زمین اتنی ہی زیادہ زرخیز ہوگی۔ پھر یہ دانہ جتنی زیادہ محنت اور جانفشانی سے حاصل کیا ہوگا اتنی ہی زیادہ اس درخت میں قوت ہوگی۔ اس کے ساتھ اگر اور اچھے کام بھی ہوتے رہے تو گویا اس درخت کو ہوا اور پانی وغیرہ افراط سے ملتے رہے۔ ان سب چیزوں کے نتیجہ میں اس درخت کی بالیں تعداد میں زیادہ ہوتی رہیں گی اور ان کی جھڑت بھی اتنی ہی زیادہ بڑھتی رہے گی۔ اس کے برعکس جو خرچ نام و نمود یا دین کے پردے میں کسی دنیاوی مقصد کے لئے ہو وہ ہتھیلی کی سرسوں ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی مثال ایسے دانوں سے دی گئی ہے جو ایسی چٹان پر جما دیئے جائیں جس پر کچھ مٹی پڑی ہو جیسے ہی زور کی بارش آئے گی یہ مٹی بہہ جائے گی ساتھ ساتھ بیج بھی ضائع ہو جائے گا۔

جس میں دماغوں کو سکون ہو۔ دلوں کو اطمینان ہو۔ ایک دوسرے پر مہربان ہو اور ہر ایک کو دوسرے پر بھروسہ ہو۔

سوال: آپ نے اپنی تقریر میں بار بار راہ خدا میں خرچ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ دولت مند کی دولت میں اللہ کا حصہ ہے پس اللہ کے حصے یا راہ خدا میں خرچ کرنے کا اگر یہ مطلب ہے کہ یہ رقم ان کو دی جائے گی جو اللہ والے کہلاتے ہیں جیسے علماء، صوفیا، مشائخ یا سادات۔ تو اس سے عوام، غربا، فقرا، اور بے روزگار لوگوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔

جواب: بے شک اسلام سے پہلے ایسا ہو چکا ہے کہ لوگوں نے راہ خدا میں خرچ کرنے کے یہی معنی سمجھ لئے تھے کہ ان کو دیا جائے جو اللہ والے کہلاتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں برہمن یا عیسائیوں اور یہودیوں میں مذہبی پیشوا، مگر اسلام نے اس غلطی کو بہت صفائی سے دور کیا ہے۔ قرآن پاک میں بار بار واضح کر دیا گیا ہے

(۱) یہ خدا کا حصہ ہے جس کی ادائیگی فرض ہے۔ مثلاً زکوٰۃ اور صدقۂ فطر یہ صرف تہی دست نادار ضرورت مندوں کو دیا جائے گا مثلاً:

(۱) یتیم بچے، بیوہ عورتیں (جن کے پاس اپنا کچھ نہ ہو)

(۲) فقرا یعنی بے روزگار جو نان شبینہ کو محتاج ہوں۔

(۳) کسی حادثہ میں مبتلا مثلاً ایسے مسافر جو ہاتھ خالی ہو گئے اور وہ اپنے وطن سے کچھ نہیں منگا سکتے۔

(۴) مقروض

(۵) قومی کام کرنے والے جو اپنا ذریعہ معاش نہیں رکھتے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ تاکید فرما دی ہے کہ نہ صرف آپ کی اولاد بلکہ آپ کے کسی ہم جد[1] کی اولاد کو بھی زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ اگر جان بوجھ کر دے دی ہے تو "زکوٰۃ" ادا نہیں ہوئی۔ فرض عین باقی رہ گیا۔ اسی طرح علماء اور مشائخ جن کا مذہباً احترام کیا جاتا ہے زکوٰۃ و صدقہ ان کو بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بیشک اسلامی حکومت اپنی آمدنی کے دوسرے مدات سے ان کی امداد کرے گی۔ مگر یہ زکوٰۃ و صدقہ جس کو اللہ کا مخصوص حصہ ہر صاحب نصاب کے سرمایہ میں قرار دیا گیا ہے۔ سادات، مشائخ اور علماء کو نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس کو "میل" قرار دیا گیا ہے اور میل کچیل ان کو نہیں دیا جاتا جن کا احترام کیا جائے۔ ان کی خدمت میں دوسری صورتوں سے ہدیہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ہم جد۔ دادا کی اولاد۔ ہاشم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پر دادا تھے۔ ان کی اولاد جو بنو ہاشم کہلاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم جد ہے۔

سود سے نفرت - کیوں؟

سوال: یہ کیا بات ہے۔ اسلام سود کے اتنا مخالف کیوں ہے کہ وہ کسی درجہ میں بھی اس کو برداشت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ایک طرف مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ نہ صرف سود کو چھوڑو بلکہ جس معاملہ میں سود کا شبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑو۔ دوسری طرف سود خواروں کو قرآن حکیم میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر وہ اس کاروبار کو نہیں چھوڑتے تو ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گویا اسلامی حکومت کو سود خوروں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم ہے

جواب: اس لئے کہ اسلام اور سود کی فطرت میں بیر ہے۔ اسلام اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور سود کی بنیاد نہایت پست اور کمینہ اخلاق پر ہوتی ہے

اسلام میل ملاپ۔ محبت اور ہمدردی کی بنیاد پر ایک خوش گوار فضا انسانی برادری میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس سود کی فطرت یہ ہے کہ وہ گھٹن۔ جلن۔ حسد۔ نفرت اور بے مروتی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اسلام انسانی برادری میں مساوات اور یکسانیت پیدا کرنا چاہتا ہے اور سود ان میں اونچ نیچ پیدا کر کے انسانی برادری کو ایسی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جو ایک دوسرے کی دشمن اور اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔

اب اس کی کسی قدر تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ انسانوں میں سخاوت، بخشش، درگذر

سیر چشمی جیسے اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں۔ ان کے حوصلے بلند ہوں۔ وہ حاتم وقت دریا دل، گنج بخش و شکر بار ہوں[1]۔ ان کی طبیعتوں میں رحم، نرمی اور ایک دوسرے کی ہمدردی ہو، وہ سب ایسے ہوں جیسے ایک بدن کے مختلف حصے۔

سود کی فطرت یہ ہے کہ سخاوت اور بخشش کا نام و نشان نہ رہے۔ ایک ایک پائی کے لئے جان نکلنے لگے۔ رشتے ناتے سب ایک دمڑی پر قربان کر دیئے جائیں۔ حوصلہ پست اور دل پتھر کا ہو جائے۔ قرضدار کے بچے بھوک سے تڑپ رہے ہوں، مگر اس کو اپنے سود کی فکر ہو۔ وہ ڈگری وصول کرنے کے لئے پہننے کے کپڑے اور گھر کے برتن تک قرق کرالے۔ اس کا ایمان اور دھرم دھن دولت ہو۔

اسلام ایسا بھائی چارہ قائم کرتا ہے جس میں ایک دوسرے کی ہمدردی ہو، جانی اور مالی مدد ہو۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جائے۔ مقروضوں کے قرضے ادا کئے جائیں جن کے کاروبار تھک گئے ہیں ان کو سہارا دیا جائے۔

سود ایسا سماج پیدا کرتا ہے جس میں ہر فرد خود غرض ہو۔ کسی کی ضرورت پوری کرنے کے بجائے اس کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔ اپنا قرض وصول کرنے کے لئے غریبوں کے کپڑے بھی اتروالے۔ پھر ہر ایک دوسرے کی دولت پر حسد کرتا ہے ہر ایک کی کوشش یہ ہو کہ اپنے وقت کا قارون بن جائے۔

اسلام "ایثار" کو سب سے اونچا درجہ دیتا ہے۔ یعنی انسان اپنی ضرورت

---

[1] تاریخ اسلام میں ایسے مشائخ امراء اور ایسے نامور ملتے ہیں جن کو یہ خطابات اسی لئے دیئے گئے کہ ان میں یہ اعلیٰ اخلاق نمایاں تھے۔

کو پیچھے ڈالے اور دوسرے کی ضرورت پوری کرے۔

سود۔ طمع، لالچ اور حرص پیدا کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ اپنا فائدہ سب سے مقدم رکھے بلکہ اگر موقع ملے تو دوسروں کا منافع بھی ہضم کر جائے۔

اسلام انسانی برادری میں ایک معاشی مساوات قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ دولت مندوں سے زکوٰۃ صدقات لے کر غریبوں کو دیتا ہے کہ ان کی تباہ حالی دور ہو۔ وہ روٹی کپڑے کی فکر سے چھٹی پا کر انسانوں جیسی زندگی گزار سکیں۔

سود۔ اس کے برعکس انسانوں میں دو طبقے بنا دیتا ہے۔ ایک سرمایہ دار اور دولت مند طبقہ جس کے خزانوں کی جھیل میں دوسروں کی دولت بھی سمٹ آئے۔ دوسرا وہ پریشان حال طبقہ جس کی دولت کی تمام نالیاں خشک ہوں جس کی زندگی اجیرن ہو اور نتیجہ یہ ہو کہ انسانی کنبہ میں نفرت۔ عداوت اور طبقاتی جنگ کی آگ بھڑک اٹھے۔

عیبش ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو[1]
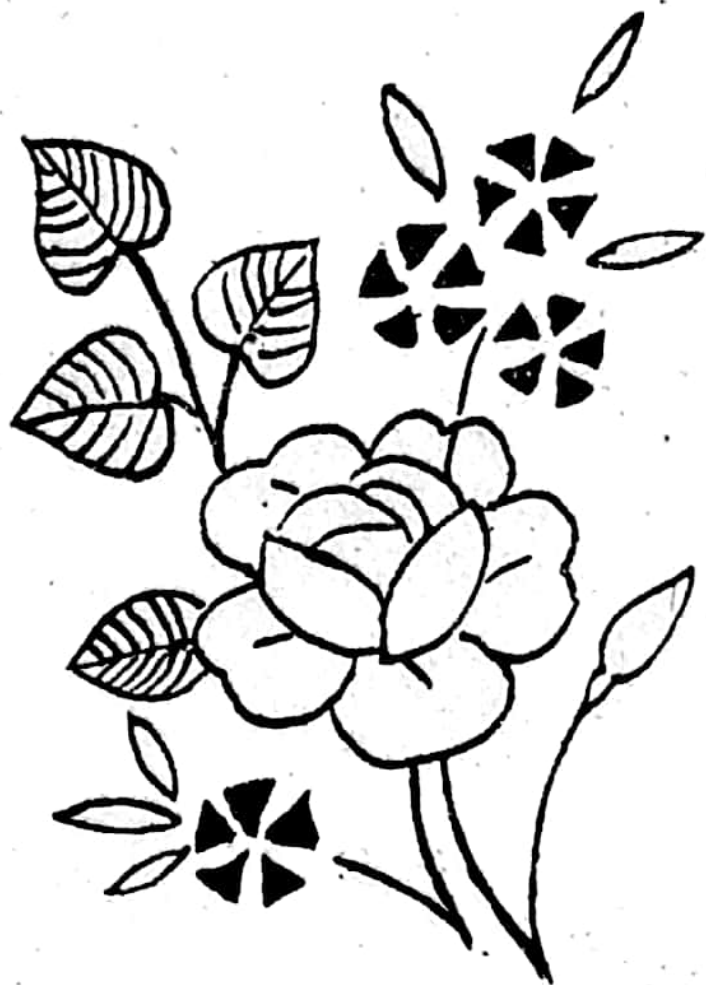
سود کے یہ نقصانات ضرور ہیں مگر جناب اس کے کچھ فائدے بھی ہیں اور یہ انصاف کی بات نہیں کہ آپ صرف نقصانات شمار کرا دیں اور فائدہ کی بات کا نام نہ لیں۔ مثلاً

(۱) کاروبار کی ترقی کے لئے آپ کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ آپ کسی دولتمند سے یا بینک سے معمولی شرح سود پر قرض لے لیتے ہیں۔ بیشک آپ کو کچھ سود دینا پڑتا ہے مگر آپ کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور کاروبار کی ترقی آگے قدم بڑھاتی ہے۔

(۲) آپ کاروباری سلسلے میں ایک جماعت (سوسائٹی) بناتے ہیں۔ اس کاروبار کے لئے پوری رقم اس جماعت کے پاس نہیں ہے، حکومت ایسی جماعتوں کو معمولی سود پر قرض دیتی ہے۔ آپ کی جماعت (سوسائٹی) بھی قرض لے لیتی ہے اور کاروبار کو فروغ دینے لگتی ہے۔

(۳) حکومت قوم اور ملک کی ترقی کے لئے کوئی منصوبہ طے کرتی ہے۔ اس کے لئے مثلاً دو ارب روپیہ کی ضرورت ہے۔ حکومت کے پاس صرف ایک ارب ہے ایک ارب کی اس کو اور ضرورت ہے۔ یا مثلاً کسی دشمن سے جنگ ہو رہی ہے حکومت کو مصارف جنگ کے لئے ایک ارب روپیہ کی ضرورت ہے۔ حکومت قرضہ جنگ یا قومی قرضہ کے نام سے اپیل کرتی ہے اور ایک سود معین کر دیتی ہے۔ یہ رقم حکومت

---

[1] تم نے اس کے عیب تو تمام شمار کرا دیئے۔ اب کچھ ہنر بھی شمار کرا دو

کو وصول ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں دونوں کا فائدہ ہے۔ حکومت اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو گئی یا جنگ میں اس نے فتح پالی اور قرض دینے والی پبلک کو یہ فائدہ کہ اس کی اصل رقم معہ سود کچھ عرصہ کے بعد اس کو واپس مل گئی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ملازم پیشہ جو کچھ کماتے ہیں اتنا ہی خرچ کر دیتے ہیں کچھ بچا نہیں سکتے۔ اس طرح اگر وہ کسی صورت سے حکومت کو قرض دے دیتے ہیں یا حکومت ان کی تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے تو ان کے پاس کچھ رقم بچ جاتی ہے اور سود سے وہ دوگنی ہو جاتی ہے اس طرح کے سود کا فائدہ عوام کو پہنچ رہا ہے۔

جواب: پہلے ایک اصولی بات سمجھ لیجئے۔ پھر جواب ملاحظہ فرمائیے۔

اصولی بات

دُنیا کی کوئی بُری سے بُری چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کچھ فائدہ نہ ہو۔ زہر سے بُری چیز کیا ہوگی (جو شرعاً حرام ہے، اور قانون اس کو ممنوع قرار دیتا ہے) لیکن اس میں بھی کچھ فائدے ہوتے ہیں جن کو اطبّا جانتے ہیں۔ پس عام اصول یہ ہے کہ بُرائی اور بھلائی یا نفع نقصان کو جانچا اور تولا جاتا ہے جس کا نفع زیادہ، نقصان کم ہو اس کو مباح اور جائز قرار دیا جاتا ہے۔ جس کا نقصان زیادہ نفع کم ہو اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیتے ہیں پس اگر سود کی بعض صورتوں میں فائدہ نظر آتا ہے تو اس کی بنا پر اس کو جواز کی سند نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اس کے نقصانات اِن فائدوں سے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔

اس کے بعد جواباً عرض ہے کہ یہ فائدے اس لئے نظر آرہے ہیں کہ سود کا رواج پوری دنیا میں عام ہو گیا ہے اور اس نے یہاں تک چکاچوند کر دیا ہے کہ

اُن کے بالمقابل جو بہتر صورتیں ہو سکتی ہیں ان کا خیال تک نہیں آتا۔

واقعہ یہ ہے کہ سود کے اس عام رواج نے لوگوں کے ذہن بدل دیئے ہیں ذہن یہ بن گیا ہے کہ ایک روپیہ بھی کسی کو دیا جائے تو اس پر نفع ضرور ملنا چاہئے اور دلیل یہ بنائی ہے کہ جس طرح آپ کوئی سامان کرایہ پر دیتے ہیں۔ سود بھی گویا روپیہ کا کرایہ ہے۔

آپ نے نمائش میں دوکان سجانے کے لئے کچھ الماریاں کرایہ پر لیں۔ جب نمائش ختم ہوگئی تو الماریاں واپس کر دیں اور کرایہ ادا کر دیا۔ اس طرح آپ کا کام بھی چل گیا کہ دوکان سج گئی۔ بکری زیادہ ہوئی اور نفع کافی ملا اور الماریوں والے کا فائدہ بھی ہوگیا کہ اس کی چیز جوں کی توں واپس مل گئی اور کرایہ نفع میں رہا۔

بہرحال یہ ذہنیت اس لئے ہے کہ دنیا پر سودی نظام چھایا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تینوں صورتیں جو سوال میں بیان کی گئی ہیں اگر یہاں رقم دینے والا سود نہ لے تو اس کا کیا نقصان ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ خود غرضی، طمع اور بخل ذہنوں میں اس طرح رچ گئے ہیں کہ بھائی چارہ اور اچھے سلوک کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ نفع اسی کو سمجھا جاتا ہے جو روپیہ کی شکل میں ہو۔ اگر وہ نہ ملے اور آپ کا پورا روپیہ واپس مل جائے تو اس کو بھی نقصان سمجھا جاتا ہے۔

غور فرمائیے جو روپیہ آپ کے پاس فاضل پڑا ہوا ہے۔ آپ کا کیا نقصان ہے اگر آپ اس کو اپنے پاس نہ رکھیں اور کسی شخص کو یا حکومت کو قرض دے دیں۔ اگر واپس نہ ہونے کا خطرہ ہو تو کوئی اطمینان کی صورت پیدا کر لیں۔ سود کی شرط لگا دینے سے تو

روپیہ محفوظ نہیں ہوتا۔ لوگ سودی قرض لیتے ہیں اور کھا جاتے ہیں بلکہ ان کی کوشش عموماً یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح قرض مار لینے کی صورت نکل آئے کیونکہ جب یہ قرض سود پر ملا ہے تو ان کو روپیہ دینے والے سے ہمدردی نہیں ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنے نفع کے لئے ہمیں قرض دیا ہے۔ ہمارا نفع اس کے پیش نظر نہیں ہے۔ پس وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ نہ سود دینا پڑے نہ اصل رقم۔

عجیب بات یہ ہے کہ امداد باہمی کا نام لیا جاتا ہے اور انجمن امداد باہمی سے جو رقم دی جاتی ہے وہ سود پر دی جاتی ہے۔ یہ امداد کیا ہوئی۔ یہ تو نفع اندوزی ہوگئی بلکہ کھلا ہوا سودی کاروبار ہوگیا۔ جن غریبوں کے نام پر انجمن امداد باہمی کا نام دیا گیا ہے ان کو تو صرف اتنا ملا کہ ان کو آسانی سے ایک خاص حد کے اندر قرض مل گیا سود سے ان کو نجات نہیں ملی۔ بہت سے بہت یہ ہوا کہ سود کی مقدار میں کمی ہوگئی۔ کسی اور جگہ دو روپیہ سیکڑہ سود دینا پڑتا یہاں ایک روپیہ سیکڑہ کا سود دینا ہوگا صرف یہی فائدہ ہوا۔

کسی شخص کو اپنے کاروبار کی ترقی کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے تو انسانی بھائی چارہ کا تقاضا یہ ہے کہ تم بلا کسی ذاتی غرض اور بلا کسی معاوضہ کے اس کی مشکل آسان کرو اور جہاں تک ممکن ہو اس کی مدد کرو۔ اور اگر تم نفع میں ساجھا چاہتے تو چور دروازہ سے نفع پر ڈاکہ مت ڈالو، بلکہ کھل کر صفائی سے کہو۔ اس کے کاروبار میں ساجھا کرو۔ نفع میں بھی شریک رہو اور نقصان بھی برداشت کرو اور اگر نفع میں ساجھا نہیں چاہتے یا نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تو بلا سودی قرض (قرض حسن) دیدو۔ نفع نقصان کا وہ ذمہ دار ہوگا۔ پس تمھاری رقم واپس مل جائے گی۔

تم سمجھتے ہو نفع صرف یہ ہے کہ ایک کا سوا یا ڈیڑھ ہو جائے۔ یہ نفع بہت معمولی ہے۔ اس کی عمر بہت کم ہے۔ حقیقی نفع یہ ہے کہ خود غرضی، بخل، حرص و طمع و حب مال کے جو سانپ ذہنوں میں چھپے ہوئے ہیں جو انسانی بھائی چارہ کو ڈستے رہتے ہیں اور ہمیں بااخلاق و بامروت انسان نہیں بننے دیتے وہ کسی طرح ذہنوں سے نکلیں۔ یہ بخل کا اژدہا آج نظر نہیں آتا۔ مگر روز جزا میں یہی اژدہا گلے کا ہار بنے گا۔

قارون سے لوگوں نے کہا تھا۔ یہ اللہ تعالے کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے لاکھوں کروڑوں میں تمھیں دولت کے خزانوں سے نوازا اور تم سے اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں لیا۔ پس تمھارا بھی یہ فرض ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔ تمھاری قدر لوگوں کے دلوں میں بڑھے گی اور تمھاری عزت پائیدار ہوگی۔

جب بھی کوئی ضرورت مند سامنے آتا ہے تو اونچے کیرکٹر اور اعلیٰ اخلاق کی فرمائش یہی ہوتی ہے۔ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

تم بھی احسان کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے

لہ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں قرض حسن کا ثواب صدقہ خیرات سے ۱۸ گنا زیادہ بتایا گیا ہے، کیونکہ تاجر یا صاحب دولت جب یہ طے کر لیتا ہے کہ صدقہ خیرات میں اس کو اپنی رقم دینی ہے تو اس سے اس کو تکلیف نہیں ہوتی۔ البتہ پروگرام کے خلاف جب گرہ سے قرض حسن دینا پڑتا ہے تو اس کی تکلیف زیادہ ہوتی اور اس سے بخل کے وصف پر زیادہ ضرب پڑتی ہے۔ لہذا اس کا ثواب بھی زیادہ ہونا چاہیے۔

افسوس۔ سود کی گرم بازاری کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس نفع کو نفع نہیں سمجھتے ہم نفع صرف ان سکوں کو سمجھتے ہیں جو کسی طرح ہمارے غلہ میں آجائے۔ خواہ کتنی ہی لعنتیں ان کے ساتھ لگی ہوئی ہوں گی۔

اسلام کہتا ہے۔ اصل نفع اخلاق کی بلندی۔ سیرچشمی اور جذبۂ ہمدردی ہے جو اس وقت ظاہر ہوتا ہے۔ جب بلا کسی ذاتی غرض کے اس کو قرض دو اور اس قرض سے کسی قسم کی مالی منفعت کا سلسلہ نہ قائم کرو۔

تم اگر امداد باہمی کی انجمن قائم کرتے ہو تو قرآن حکیم کے اصول پر قائم کرو دولت مندوں سے کہو کہ اللہ کا تم پر احسان ہے۔ تم خلق خدا پر احسان کرو۔ فاضل رقم صدقہ کرو۔ خیرات کرو۔ لوگوں کو قرض دو، یہی ہے انسانی بھائی چارہ اور یہی ہے تقاضاء انسانیت۔

حکومت کا یہ اعلان بہت ہی پیارا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کاروبار کی جماعتیں (سوسائٹیاں) بنا کر کام بڑھائیں۔ حکومت ان کی یہ امداد کرے گی کہ ان کو قرض دے گی۔ البتہ کچھ سود ضرور ادا کرنا ہوگا تاکہ اس لین دین کے حساب وغیرہ پر جو کچھ خرچ ہوا وہ اس سود سے پورا ہوتا رہے اور حکومت کو گھاٹا نہ ہو۔

حقیقت یہی ہے کہ سودی نظام دنیا کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اس لئے یہ اعلان پیارا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اگر غور سے دیکھیں تو حکومت کا یہ اعلان مجرمانہ ہے۔ حکومت ایک طرف لوگوں کو ناجائز نفع، خودغرضی اور فریب سے منع کرتی ہے اور دوسری طرف اس طرح کے اعلان سے خود ان گناہوں کی تعلیم دیتی ہے۔

ایک طرف امداد کا نام اور دوسری جانب سود کی شرط۔ یہ وہی خود غرضانہ ذہنیت ہے کہ احسان اور سلوک کہیں بھی نہ ہو۔ ایک پیسہ بھی اگر کسی کو دیا جائے تو اس کا نفع ملنا چاہیئے۔

اسی ذہنیت کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے حساب کتاب پر جو خرچ ہوا اس کو حکومت خسارہ قرار دیتی ہے۔ حالانکہ پبلک مفاد کے کاموں پر جو خرچ ہوا اس کو خسارہ قرار دینا محض مغالطہ اور فریب ہے۔

پولیس، فوج، حفظان صحت، تعلیم وغیرہ پر جو خرچ ہوتا ہے۔ کیا وہ خرچ بھی کسی سود سے پورا کیا جاتا ہے۔ اگر ان محکموں کے لئے سود نہیں لیا جاتا، حکومت کی آمدنی سے چلائے جاتے ہیں تو یہ سوسائٹیاں بھی مفاد عامہ کے لئے ہیں۔ ان کا خرچ بھی حکومت کو برداشت کرنا چاہیئے۔ پھر پبلک کے خسارہ کو خسارہ نہ ماننا حکومت کی ناانصافی ہے۔ سوسائٹی کے ممبر جو سود ادا کریں گے کیا وہ خسارہ نہیں ہے۔ حکومت کی خیر خواہی یہ ہے کہ خود خسارہ اٹھا کر پبلک کو خسارہ سے بچائے نہ یہ کہ اپنے آپ کو خسارہ سے بچانے کے لئے پبلک پر دوچند خسارہ ڈالا جائے۔

قومی اور جنگی قرضے

قومی یا ملکی ترقی کے کسی منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے جو پبلک سے قرضہ لیا جاتا ہے یا لڑائی کے موقع پر قرضۂ جنگ حاصل کیا جائے۔ ان کے نام اگرچہ دل کش ہیں مگر ان کی حقیقت وہی خود غرضانہ ذہنیت ہے کہ اپنی جیب سے کچھ نہ جائے اور جو غریب طبقہ دولت سے محروم ہے سارا بار اُس پر ڈال دیا جائے۔ نام ہو دولت مندوں کا اور پیٹ کٹے غریبوں کا۔ حکومت نے اعلان کیا اور دولت مندوں نے حکومت کو قرضہ دے کر سارٹیفکیٹ حاصل

کر لئے اور مدت گزرنے پر سارٹیفکٹ دکھا کر اصل رقم سود سمیت حاصل کرلی۔ ایک ہزار قرض دیا تھا۔ پانچسو سود کے ملے۔ مدت گزرنے پر ہزار کے ڈیڑھ ہزار وصول کر لئے۔ دولت مند کی دولت میں اضافہ ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ حکومت نے یہ قرض کہاں سے ادا کیا۔ جواب صاف ہے ٹیکس بڑھا کر، یا کوئی نیا ٹیکس ایجاد کر کے مثلاً کپڑے، تمباکو یا عام چیزوں کی بکری پر ٹیکس لگا دیا کہ ایک روپیہ کا کپڑا بکے تو ایک آنہ ٹیکس۔ جن دولت مندوں نے حکومت کو جنگی یا قومی قرضہ دیا تھا وہ سو میں ایک ہیں اور یہ غریب کپڑا خریدنے والے سو میں ننانوے۔ پس نام ہوا دولت مندوں کا اور ادا کرنا پڑا ان غریبوں کو۔

اسلام ایسی منافقت اور نمائش کی جڑیں اکھاڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے اصل مرض بخل، طمع اور حب مال ہے جو ان دولت مندوں کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

اسلام ذہنیت میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اسلام ایک طرف اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر ان کو رائج کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف انسانوں کی ذہنیت پر دستک دیتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت پر نظر ڈالے اور اپنے مستقبل اور اپنے مآل و انجام کو سامنے رکھے، جو کچھ وہ خرچ کر رہا ہے وہ دوسرے کے لئے نہیں بلکہ خود اس کے لئے ہے۔ زندگی چاہتے ہو تو راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ورنہ خود تم تباہ ہو جاؤ گے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۔ و	خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں۔ اور

اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (سورہ بقرہ ع ۲۴) احسان کرو۔ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

اسلام دولت مندوں کو جھنجھوڑتا ہے اور ان کو آگاہ کرتا ہے کہ قومی اور ملی مطالبہ کے وقت اگر تم بخل کر رہے ہو تو یقین رکھو کہ یہ سونے اور چاندی کے سنہری اور روپہلی ڈھیر امن اور اطمینان کی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ جس آخری انجام کو تم پہنچنے والے ہو، وہ یہ ہوگا کہ یہ ڈھیر اژدہا بنیں گے اور تمھارے گلے میں لپٹ کر تمھاری باچھیں چیریں گے اور کہیں گے میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔

دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔ جو لوگ سونا اور چاندی جوڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو اُن کو دردناک عذاب کی بشارت سنا دیجئے۔

قیامت کے روز ان خزانوں کو آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے ان دولت مندوں کے پہلو اور پیشانیاں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا یہ ہے وہ جس کو تم نے جوڑ کر رکھا تھا۔ (سورہ توبہ رکوع ۵)

بہرحال اسلام جس سیدھے سادے نظام کی تعلیم دیتا ہے اس میں یہ داؤ پیچ بالکل نہیں جن کو آج کے سیاسی اور اقتصادی بلاک اختیار کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس گندم نمائی اور جو فروشی میں بھی وہ ایک دوسرے سے بڑھ جائیں۔

جس چیز کو ہم قومی یا جنگی قرضہ کہتے ہیں۔ اسلام کہتا ہے وہ قوم پر قرض

نہیں ہے۔ قوم تو خود یہ ہے جو قرض دے رہی ہے۔ اپنا قرض اپنے اوپر کیسے واجب ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالے قرآن شریف میں بار بار اعلان کرتا ہے کہ یہ قرض اللہ کے ذمہ ہے وہ اس کو ادا کرے گا اور اَضۡعَافاً مُّضَاعَفَہ (چند ہا چند) کر کے ادا کرے گا۔ خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا بڑھا کر ادا کرے گا۔

پس تم اس کی وصولی کے لئے غریبوں کی جیبوں پر نظر مت رکھو۔ بلکہ خدا کے فضل و کرم پر نظر رکھو۔

اسلام کہتا ہے۔ حکومت کی طرف سے ایسے قرض طلب کرنا اور دولتمندوں کا اس رقم کو قرض کے طور پر دینا دونوں باتیں مغالطہ ہیں اور یہ مغالطہ اس بنا پر ہے کہ نہ حکومت نے اپنی حیثیت کو سامنے رکھا اور نہ دولتمندوں نے اپنا فرض محسوس کیا۔

قوم کی تعمیر و ترقی۔ ملک کی حفاظت فرض ہے۔ ایسا ہی فرض جیسے نماز۔ روزہ۔ اس پر خرچ کرنا فرض ہے۔ جو ادائے فرض کے لئے خرچ کیا جاتا ہے وہ قرض نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم میں جگہ جگہ حکم ہے کہ اپنے جان و مال سے جہاد کرو۔ نادان سمجھتے ہیں کہ جہاد لڑائی کو کہتے ہیں۔ لڑائی اگر ہوتی ہے تو ہاتھ پاؤں یا ہتھیاروں سے۔ مال سے لڑائی نہیں ہوتی۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ جہاد کو لڑائی سمجھا جائے۔

جہاد نام ہے اس سرگرم کوشش کا جو اخلاص اور جاں نثاری کے ساتھ راہِ حق و صداقت میں ظاہر ہو۔ جس کے لئے مال کے موقع پر مال قربان

کیا جائے اور جان کے موقع پر جان۔

پس غریبوں پر اسلام ایک جہاد واجب کرتا ہے۔ یعنی سرگرم جدّ وجہد جو عمل کے ذریعہ ہو اور دولت مندوں پر دو جہاد واجب کئے ہیں۔ ایک عملی جد وجہد۔ دوم مالی قربانی۔ زکوٰۃ وصدقہ اپنی جگہ فرض ہے۔ لیکن جب بھی ملک وملّت کا مطالبہ ہو۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر تم اپنی دولت خرچ کر کے اس ملّی اور قومی مطالبہ کو پورا نہیں کر رہے ہو تو اپنے آپ کو اور اپنی پوری قوم کو ہلاکت میں ڈال رہے ہو۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ (سورہ بقرہ ع ۲۴)	راہ خدا میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

سورہ محمد کی آخری آیتیں عمل کرنے کے لئے ہمیشہ یاد رہنی چاہئیں۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ	دیکھو تمھیں دعوت دی جا رہی ہے (تم سے فرمائش کی جا رہی ہے) کہ تم راہ خدا میں خرچ کرو۔ پس تم میں سے کچھ ہیں جو بخل کرتے ہیں وہ بخل کرتے ہیں خود اپنے آپ سے (جو نہیں دیگا سو نہیں دیگا اپنے آپ کو) اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو (ضرورتمند) ملی اور قومی ضرورتیں خود تمھاری ضرورتیں ہیں، خدا کی ضرورتیں نہیں ہیں اور اگر تم پھر جاؤ گے بدل لیگا کسی دوسری قوم کو تمھارے سوا۔ پھر وہ نہ ہوں گے تمھاری طرح کے۔

جب یہ جوابات ختم ہو گئے تو مجلس ختم ہو گئی اور یہاں یہ کتاب بھی ختم ہو گئی

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

چند دُعائیں

کاروباری سرگرمیوں میں اللہ کی یاد

پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر اللہ کی یاد کرتے رہو یا کسی مسجد کے حجرہ میں معتکف ہو کر وظیفے پڑھتے رہو۔ یہ بڑی خوبی نہیں۔ بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں لگو، کاروبار کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرو۔ ملک و ملت کی خدمت میں وقت صرف کرو، مگر دل میں ہر وقت اللہ کا خوف ہو۔ ہو میں یاد خدا ہو اور زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، جو کام شروع کرو اللہ کے ذکر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعا سے شروع کرو۔

اس حصہ میں جس کو آپ ختم کر رہے ہیں کاروبار کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ لہٰذا ہم چند دعائیں یہاں لکھتے ہیں جو کاروبار کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں انھیں یاد کرلو اور اپنے موقع پر پڑھتے رہو جب گھر سے باہر قدم نکالو تو یہ دعا پڑھو۔

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (صحاح)

اللہ کے نام پر (باہر نکل رہا ہوں) بھروسہ کیا میں نے اللہ پر نہیں کوئی طاقت اور نہیں کوئی قوت مگر اللہ کی مدد سے

جب گھر میں داخل ہو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْمَوْلَجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا

اے اللہ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا مکان میں جانا خیر و برکت کے ساتھ ہو اور مکان سے نکلنا بھی خیر و برکت کے ساتھ ہو۔ اللہ کے نام پر ہم مکان میں داخل ہو رہے ہیں اور اسی کے نام پر مکان سے نکلے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر جو ہمارا پروردگار ہے ہم نے بھروسہ کیا۔

جب بازار میں داخل ہو رہے ہو تو یہ دعا پڑھو۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

نہیں کوئی معبود مگر صرف اللہ اکیلا۔ نہیں کوئی سا جھی اُس کا اُسی کا ملک ہے اور اسی کے لئے ہے تعریف وہ جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے اسی کے ہاتھ میں ہے بھلائی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ السُّوْقِ وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُصِيْبَ فِيْهَا يَمِيْنًا فَاجِرَةً اَوْ صَفْقَةً خَاسِرَةً

اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی اس بازار کی اور بھلائی ہر اس چیز کی جو اس بازار میں ہے اور پناہ لیتا ہوں تیری اس بازار کے شر سے اور ان تمام چیزوں کے شر سے جو اس بازار میں ہیں۔ اے اللہ میں پناہ لیتا ہوں تیری اس بات سے کہ میں کھاؤں اس بازار میں کوئی جھوٹی قسم یا کر بیٹھوں کوئی سودا نقصان والا۔

جب آپ کی نظر اپنے مال پر پڑے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ

اے اللہ رحمت نازل فرما حضرت محمد پر (صلی اللہ علیہ وسلم) جو آپ کے بندے اور رسول ہیں اور تمام ایمان دار مردوں اور تمام ایمان دار عورتوں پر اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں پر

جب موسم کا نیا پھل سامنے آئے۔

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ مَدِيْنَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ صَاعِنَا[1] وَ

اے اللہ برکت عطا فرما ہمارے پھل میں اور برکت عطا فرما ہمارے شہر میں اور برکت عطا فرما ہمارے "صاع"[1] میں اور

[1] صاع اور مد پیمانوں کے نام ہیں جن سے ناپ کر غلہ دیا جاتا ہے۔ صاع میں دوسو ستر تولہ گیہوں آتے تھے یعنی تین سیر چھ چھٹانک اور مد کہیں صاع کا پانچواں حصہ ہوتا تھا یعنی تقریباً ۱۱ چھٹانک اور کہیں آٹھواں حصہ ہوتا تھا یعنی تقریباً ۷ چھٹانک۔ رطل بھی ۷ چھٹانک کا ہوتا تھا یعنی ۳۵ تولہ۔

یَا رَبِّ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا — برکت عطا فرما ہمارے مُد میں

جب بازار سے واپس ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ قرآن شریف کی دس آیتیں پڑھ لیں۔ آیتیں مقرر نہیں ہیں جو آیتیں بھی یاد ہوں وہ پڑھ لیں مثلاً سورہ بقرہ یا سورہ آل عمران کا آخری رکوع یاد ہو تو وہی پڑھ لیں۔

اگر خدانخواستہ آپ کے ذمہ قرض ہو جائے تو یہ دعا پڑھیں۔ ترکیب یہ ہے کہ نماز صبح اور نماز مغرب کے بعد دل لگا کر سات مرتبہ یہ دعا پڑھیں اور اوّل و آخر سات سات مرتبہ درود شریف۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ پانچوں نمازوں کے بعد تین تین مرتبہ یہ دعا اور اوّل و آخر تین تین مرتبہ درود شریف۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ	اے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں۔ پریشانی
وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ	اور غم سے اور تیری پناہ لیتا ہوں عاجزی
وَالْكَسَلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ	اور سستی سے اور تیری پناہ لیتا ہوں بزدلی
وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ	اور بخل سے اور تیری پناہ لیتا ہوں قرض کے
الدَّيْنِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ	چڑھ جانے سے اور لوگوں کے قہر سے۔

اگر آپ کا کسی کے ذمہ قرض ہو۔ تو جب وہ شخص قرض ادا کرے تو آپ اس کو یہ دعا دیں۔

اَوْفَيْتَنِيْ اَوْفَى اللّٰهُ بِكَ	تم نے میرا حق پورا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمہارا پورا پورا حق ادا فرمائے۔

والسلام خیر ختام

۲۵ رجمادی الاول ۱۳۹۲ھ ، ۷ رجولائی ۱۹۷۲ء